بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

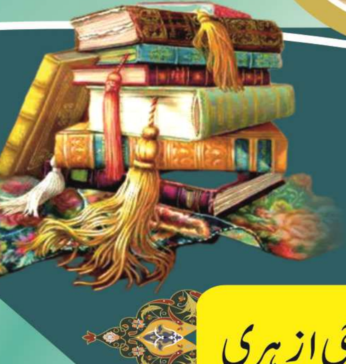
﴿إِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾

قرآنِ کریم پر اعتراضات کا زبردست علمی و تحقیقی جواب

بنام

دفاعِ قرآن





مؤلف:

محمد نظام احسنی مصباحی ازہری



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾

قرآنِ کریم پر اعتراضات کا زبردست علمی و تحقیقی جواب

بنام

دفاعِ قرآن

مؤلف:

محمد نظام احسنی مصباحی ازہری

ناشر

نظامی اکیڈمی (بریلی شریف)

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں:

کتاب کا نام : دفاع قرآن

تالیف : محمد نظام احسنی مصباحی ازہری

تصحیح : مفتی ذیشان رضا مصباحی

تعداد صفحات : 338

فارمیٹنگ، سیٹنگ : محمد عامر احمد امجدی (7503518254)

قیمت : 250

ناشر : نظامی اکیڈمی (بریلی شریف)

ملنے کا پتہ:

گھر بیٹھے ڈاک کے ذریعے کتاب حاصل کرنے کے لیے درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں:

+91 7618141015

فہرست

عرض مؤلف

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله صلى الله عليه وسلم عبده ورسوله الصادق الناصح الأمين،وعلى آله وصحبه أجمعين۔

قران کریم اللہ تبارک وتعالی کی نازل کردہ سب سے اخری اور سب سے افضل کتاب ہے اس کے احکام وفرامین تا قیام قیامت باقی رہنے والے ہیں اسی طرح یہ مقدس کلام بھی باقی اور محفوظ رہنے والا ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ رب العزت نے لی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا ہے۔{إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ} (الحجر:۹)

ترجمہ۔بے شک ہم نے یہ قران اتارااور بے شک ہم خوداس کے نگہبان ہیں۔

قران مقدس کے مطالب وہ مفاہیم سمجھنے کے لیے متعدد علوم درکار ہیں اس حوالے سے امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالی علیہ رقمطراز ہیں: مفسر کم از کم درج ذیل علوم پر دسترس رکھتا ہو۔

علم لغت،نحو،صرف،استقاق،معانی،بیان،بدیع،قراءت، حدیث،اصول حدیث، اصول فقہ،اسباب نزول،قصص القران،ناسخ ومنسوخ،محاورات عرب،تاریخ،اور علم لدنی۔(الإتقان في علوم القران،ج:۲،ص:۲۸۰)

جو لوگ ان علوم سے یا بعض علوم سے واقف نہیں ہوتے ہیں جس سے وہ قران پاک کے معانی و مفاہیم نہیں سمجھ پاتے ہیں پھر قران پاک پر اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ قران کریم آسمانی کتاب نہیں چونکہ اس میں یہ غلطیاں ہیں، نحوی، صرفی، بلاغی، ایات میں تعارض ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے بے جا شبہات پیدا کرنے لگتے ہیں۔

ناظرین اپ کے سامنے جو کتاب بنام ''دفاعِ قران'' ہے یہ درحقیقت امام فخر الدین رازی کی کتاب "**مسائل الرازي وأجوبتها**" کی تلخیص ہے اس کتاب میں اپ نے 1200 سے زائد اعتراضات اور ان کے جوابات ذکر کیے ہیں جن میں سے ہم نے کچھ اعتراضات نقل کیے اور ان کے جوابات کچھ اس کتاب سے ذکر کیے اور کچھ دیگر معتبر کتب سے نقل کیے ہیں، اس کے علاوہ الگ سے بعض اعتراضات اور ان کے جوابات کا بھی اضافہ کیا ہے جن کے لیے درج ذیل کتابوں کو ماخذ و مرجع بنایا ہے۔

''**مفاتیح الغیب**'' امام فخر الدین رازی ''**جامع البیان**''۔ امام ابن جریر طبری'' **الجامع لحکام القران**''۔ محمد بن احمد قرطبی ''**معالم التنزیل**''۔ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی، ''**تفسیر الکشاف**''۔ جار اللہ زمخشری ''**التحریر والتنویر**''۔ امام ابن عاشور۔

فائدہ نمبرا۔ اس کتاب میں قران پاک کی کسی بھی آیت کا معنی و مفہوم یا تفسیر اپنی طرف سے نہیں بیان کی گئی ہے مفسرین اور ماہرین علم وفن نے آیت قرانیہ کے جو معانی و مفاہیم بتائے یا کسی ایت کی تفسیر کی اسی کی روشنی

میں جواب دیا گیا ہے اپنی رائے سے کسی لفظ کا معنی بیان کرنے سے، یا آیت کریمہ کی تفسیر کرنے سے بالکلیہ اجتناب کیا گیا ہے چونکہ احادیث مبارکہ میں اس کی مذمت وارد ہے ترمذی شریف کی حدیث پاک ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (جامع الترمذي، ج۵، ص ۶۵، رقم الحديث: ۲۹۵۰)

ترجمہ۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے بنا جانے قرآن کے بارے میں کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔ ایک دوسری حدیث مبارک ہے:

عَنْ جُنْدَبِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ
(جامع الترمذي، ج٥، ص٦٦، رقم الحديث: ۲۹۵۲)

ترجمہ۔ حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص قران کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہے اور درست بھی کہے تو بھی اس نے خطا کی۔

فائدہ نمبر ۲۔ بعض قرانی ایات کا ترجمہ کرتے وقت لفظی ترجمے کو ملحوظ رکھا ہے تاکہ اس لفظ پر اعتراض قائم ہو سکے پھر اس کے جواب میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہاں لفظ کا حقیقی معنی مراد ہے یا مجازی یا اصطلاحی۔

فائدہ ۳۔ کسی تفسیر کی کتاب کا حوالہ دیتے وقت کتاب کا نام ذکر کیا ہے

لیکن مکمل حوالہ مثلاً صفحہ جلد وغیرہ ذکر نہیں کی، وجہ یہ ہے کہ جس آیت کی تفسیر میں اس تفسیر کی کتاب سے عبادت نقل کی گئی تو اس کتاب میں اسی آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت اصل عبادت تک پہنچنا آسان ہے اس لیے مکمل حوالہ ذکر نہ کیا۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں التجا ہے کہ اس مختصر کاوش کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اپنے حبیب کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے صدقے میں ہم سب کو علم و عمل کی دولت سے نوازے۔ آمین بجاہ النبی الأمین

محمد نظام احسنی مصباحی ازہری

۲۰۔جمادي الأول ۱۴۴۶ھ

❁❁❁❁❁

مقدمہ

نحمدہ و نصلی ونسلم علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

قرآن کریم اللہ رب العزت کی وہ آخری آسمانی کتاب ہے جس نے بنی نوعِ انسان کو ہر باطل اور ہر گمراہی سے نکال کر حق و ہدایت کے راستے پر ڈالا۔ یہ وہ مبارک کتاب ہے جو اپنے زمانہ نزول سے لے کر قیامت تک کے لیے انسانیت کی رہنمائی کا ضامن ہے۔ دیگر آسمانی کتابوں کی طرح اس کے لیے امتیوں کی حفاظت کافی نہیں رکھی گئی بلکہ خود رب کائنات نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور فرمایا: {إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ} تاریخ شاہد ہے کہ جب یہ آفتابِ ہدایت پوری آب وتاب سے چمکا تو معاندین اور منکرینِ حق نے اپنی محرومی اور کج فہمی کے باعث اس پر اعتراضات شروع کر دیئے۔ کبھی اسے جادو کہا گیا، کبھی شاعری، کبھی قصہ و کہانی۔ کسی نے اسلوب پر کلام کیا، کسی نے نحوی، صرفی خامیاں نکالی، کسی نے فصاحت وبلاغت کو چیلنج کرنے کی سعی پیہم کی، کسی نے متشابہات میں الجھانے کی کوشش کی، اور کسی نے ناسخ ومنسوخ اور ظاہری تعارض کو بنیاد بنا کر شکوک و شبہات پھیلائے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ آج کے کج فہم، مستشرقین کے فضلہ خور قرآن مجید کو محض ایک انسانی تصنیف ثابت کرنے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراضات جہالت وتعصب کا نتیجہ ہے جن کا مقصد صرف ایمان والوں کے دلوں میں شبہ ڈالنا ہے جس میں کبھی کامیاب نہ ہونگے۔ ان شاء اللہ عزوجل کیوں کہ, اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایسے رجالِ کار پیدا فرمائے جو اس کتابِ ہدایت کے حصارِ مدافعت کو مضبوط کرتے رہے۔ مفسرین کرام وعلمائے اسلام نے نہ صرف قرآن مجید کی آیات کریمہ کی تفسیر وتشریح کی بلکہ معترضین کے شکوک کا ایسا مدلل جواب دیا کہ ان کے ہر تیر کی نوک کند ہوگئی۔ ائمہ تفسیر نے اپنی اپنی کتابوں میں سلف صالحین کے اقوال کو جمع کر کے قرآن کے دفاع کا علمی قلعہ تعمیر کیا۔ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ والرضوان نے اپنے زمانے میں فلسفیانہ اور عقلی اعتراضات کا جواب دے کر ملحدین کے ذہنوں کو مسکت حجت کے ساتھ لاجواب کیا۔ ان کی تصنیف ''مسائل الرازی وأجوبتھا'' میں بارہ سو سے زائد اعتراضات اور ان کے جوابات محفوظ ہیں جو آج بھی اہلِ علم کے لیے روشنی کا منبع ہیں۔

قدیم و جدید جلیل القدر مفسرین نے اپنے اپنے اسلوب میں قرآن کی عظمت کو اجاگر کیا اور اس کے محاسن کو نمایاں کیا اور کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "دفاعِ قرآن" انہی علمی کوششوں کی خوشہ چینی کرتے ہوئے ہمارے عزیز شاگرد مولانا مفتی محمد نظام احسنی مصباحی ازہری سلمہ الباری تعالیٰ نے تحریر کی ہے۔

امام رازی کی معرکۃ الآراء کتاب "مسائل الرازي وأجوبتها" کی تلخیص پیش کی ہے نیز دیگر معتبر تفاسیر سے بھی استفادہ کیا تا کہ معترضین کے اعتراضات کے جوابات زیادہ جامع اور مدلل انداز میں سامنے آئیں۔

موصوف سلمہ نے قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر اپنی رائے سے بیان کرنے کوشش نہیں کی بلکہ صرف مفسرین کرام ومحدثین عظام کے اقوال کی روشنی میں جواب دیا ہے۔اس طرح یہ کاوش خالصتاً اہلِ علم کی امانت پر مبنی ہے،جس میں ذاتی رائے یا تاویلات کا شائبہ تک نہیں ہے۔

ان شاءاللہ عزوجل یہ کتاب قرآن کی حقانیت کے چراغ کومزید روشن کرے گی ،جس سے پڑھنے والے کو نہ صرف قرآن مقدس پر کیے جانے والے اعتراضات اورشبہات سے آگاہی ہوگی بلکہ ان کے مدلل جوابات اطمینان وسکون حاصل ہوگا۔امید ہے کہ یہ تحریر ایمان والوں کے دلوں میں یقین کواور پختہ کرے گی،اورمنکرین حق کے اعتراضات کے جواب میں ایک مضبوط علمی حوالہ ثابت ہوگی۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مفتی محمد نظام احسنی مصباحی ازہری سلمہ کی اس کاوش کوشرفِ قبولیت عطا فرمائے،اسے ہمارے اوران کے لیے صدقہ جاریہ بنائے،اورامت مسلمہ کوقرآن کریم سے وہ تعلق عطا کرے جواس کے شایانِ شان ہے۔

پروردگار! ہمیں قرآن کو پڑھنے،سمجھنے اور اس پرعمل کرنے کی توفیق مرحمت فرما،اورہمیں ان لوگوں میں شامل کرجن کے قلوب تیرے کلام کے نور سے منورہیں۔آمین یارب العالمین بجاہ سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مفتی محمد عمار خان شامی

استاذ: جامعہ احسن البرکات (خانقاہ برکاتیہ،مارہرہ شریف)

❁❁❁❁❁

سورة الفاتحہ

۱۔الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ [سورۃالفاتحہ:۲]

ترجمہ: بہت مہربان رحمت والا۔

۱۔**اعتراض:** لفظ ''رحمٰن،رحیم'' سے ''ابلغ ہے'' اور اہل عرب کے یہاں یہ مسلم ہے کہ جب کسی کے اوصاف بیان کیے جائیں تو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہو۔

اور بلاغت کا قاعدہ بھی یہی ہے اس اعتبار سے ''الرحیم الرحمٰن'' ہونا چاہیے نہ ''کہ الرحمٰن الرحیم''؟۔

جواب: اسماعیل بن حماد جوہری کا کہنا ہے کہ لفظ رحمٰن اور رحیم ایک ہی معنیٰ میں ہیں لہذا اعتراض وارد نہ ہوگا۔

۲۔رحمٰن کی تفسیر ''رحمٰن الدنیا'' سے بھی کی گئی ہے اس لیے کہ دنیا میں اللہ پاک کی رحمت مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے،اور رحیم کی تفسیر ''رحیم الآخرۃ'' سے کی گئی ہے اس لیے کہ آخرت میں اللہ عزوجل کی رحمت صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص ہوگی چونکہ دنیا کی رحمت مقدم ہے اس لیے رحمٰن کو مقدم کیا اور رحیم کو مؤخر کیا ہے۔

۳۔لفظ ''رحمٰن ''زیادہ بلیغ ہے اس لیے یہ بڑی بڑی تمام نعمتوں کو شامل ہے اور ان کے علاوہ جو چھوٹی چھوٹی نعمتیں ہیں ان کے لیے رحیم کا لفظ بعد میں لائے کہ یہ تتمہ کے طور پر ہو جائے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ[سورۃالفاتحہ:۳]
ترجمہ: روز جزا کا مالک۔

اعتراض: یعنی اللہ پاک روز قیامت کا مالک ہے،لیکن رب تعالیٰ تو تمام جہان کا مالک ہے پھر روز قیامت کی تخصیص کیوں کی گئ؟

جواب: قیامت کے دن کی تخصیص اس روز کی تعظیم کے لیے کی کہ وہ بڑا عظیم دن ہوگا۔

۲۔ یا اس لیے کہ قیامت کے دن صرف اور صرف اللہ رب العزت کا ہی حکم چلے گا،اسی کی بادشاہت چلے گی،اس دن رب تعالیٰ فرمائے گا۔

﴿مَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾[غافر:۱۶]
ترجمہ: آج کس کی بادشاہت ہے،ایک اللہ کی جو سب پر غالب ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ[سورۃالفاتحہ:۳]
ترجمہ: ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں۔

اعتراض: یہاں عبادت کو استعانت پر مقدم کیا گیا ہے۔حالانکہ استعانت عبادت پر مقدم ہے اس لیے کہ بندہ عبادت کے لیے بھی اللہ پاک سے مدد چاہتا ہے، جب رب تبارک وتعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے تبھی وہ عبادت کرتا ہے۔

جواب: یہاں تقدیم وتاخیر پر حرف ''واو'' سے استدلال کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ ''واؤ'' ترتیب پر دلالت نہیں کرتا، وہ تو مطلق جمع کے لیے آتا ہے۔

۲۔ یہاں عبادت سے مراد توحید ہے،اور توحید استعانت اور تمام عبادات پر مقدم ہے اس لیے کہ جو توحید ورسالت کو ہی نہ مانے گا وہ عبادات پر اللہ تعالیٰ سے مدد کیوں کر مانگے گا؟

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ [سورۃالفاتحہ:۴]

ترجمہ: ہم کو سیدھا راستہ چلا۔

اعتراض: صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے، یا قرآن ہے یا پھر جنت کا راستہ ہے جیسا کہ کتب تفسیر میں مرقوم ہے۔لیکن مؤمنین تو اس راستے پر پہلے سے ہیں پھر طلب ہدایت کا کیا مطلب ہے؟ یہ تو تحصیل حاصل ہے جو کہ باطل ہے۔

جواب: اس کا معنیٰ یہ ہے کہ بندہ اللہ پاک سے ثابت قدمی طلب کرے،اور اس پر مداومت وہمیشگی کے لیے دعا کرے، جیسے قرآن پاک میں آیا ہے۔

''وَ الَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًى'' [سورہ محمد:۷۶]

ترجمہ: اور جنہوں نے راہ پائی اللہ نے ان کی ہدایت اور زیادہ فرمائی۔

''وَيَزِيۡدُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا هُدًى'' [سورہ محمد:۱۷]

ترجمہ: اور جنہوں نے ہدایت پائی اللہ انہیں اور بڑھائے گا۔

❁❁❁❁❁

سورة البقره

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾[سورہ بقرہ:۲]

ترجمہ: وہ بلند رتبہ کتاب جس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔

اعتراض: یہاں فرمایا گیا کہ قرآن پاک میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ،لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے بدمذہب اور گمراہ لوگ ہیں جو اس میں شک کرتے ہیں،اس پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔

جواب: ا۔ لاریب فیہ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک میں شک کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کے باوجود لوگ جان بوجھ کر اس میں نکتہ چینی کریں تو یہ ان کی کم عقلی ہے۔

۲۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ و رسول اور مومنین کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

۳۔ یا یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن پاک بالکل واضح اور روشن کتاب ہے اور اس کے دلائل نہایت قوی ہیں لہذا کوئی بھی عاقل غور وفکر کے بعد شک وشبہ میں نہ رہے گا بلکہ وہ تسلیم کرے گا کہ یہ قرآن وحی الٰہی ہے اور معجزہ ہے۔

۴۔ یا لاریب منفی ہے لیکن نہی کے معنی میں ہے تو معنی ہوا ''لا ترتابوا فیہ أنہ من عند اللہ تعالی'' کہ اس بات میں شک مت کرو کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾[سورہ بقرہ:۲]

ترجمہ:اس (قرآن پاک) میں ہدایت ہے متقین کے لیے۔

اعتراض: اس میں کہا گیا کہ قرآن پاک متقین کے لیے ہدایت ہے۔ لیکن متقین تو ہدایت یافتہ ہی ہوتے ہیں پھر تو یہ تحصیل حاصل ہوا۔

جواب: یہاں بھی ہدایت سے مراد دوام اور ثابت قدمی ہے۔جس کی تائید ارشاد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے۔﴿وَ الَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾[محمد:۱۷]

ترجمہ:اور جنھوں نے راہ پائی اللہ نے ان کی ہدایت اور زیادہ فرمادی۔

اگر چہ قرآن کریم مومن اور کافر سب کے لیے ہدایت ہے لیکن متقین ہی اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اس لیے ''هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ'' فرمایا۔

﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ [البقرہ:۹]

ترجمہ:وہ اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں۔

۳۔**اعتراض:** دھوکہ تو اسے دیا جاتا ہے جو انجام سے بے خبر ہو،اور اللہ رب العزت سے کچھ مخفی نہیں ہے﴿وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾[البقرہ: ۲۹] کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔پھر یہاں ''یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ'' کا کیا معنی ہے؟

جواب: اس آیت کریمہ میں مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے اصل عبارت یہ ہے۔

''یخٰدعون رسول اللہ'' کہ یہ منافقین اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ دیتے ہیں:ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ'' [الفتح:۱۰]

ترجمہ: وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

۲۔ یہاں یہ معنی نہیں کہ یہ منافقین اللہ پاک کو دھوکہ دیتے ہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ یہ اللہ پاک کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، جبکہ انھیں یہ نہیں پتہ کہ اللہ رب العزت تو ہر چیز سے واقف ہے لہذا اس کو دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

قرآن پاک کا ترجمہ بنام کنز الایمان (اعلیٰ حضرت محدث بریلوی کا ترجمہ) اگر دیکھا جائے تو یہ اعتراض ترجمہ سے ہی دفع ہو جاتا ہے۔

آپ نے ترجمہ یوں فرمایا: (یہ منافقین) اللہ کو فریب دینا چاہتے ہیں۔

۳۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں اور مومنین کو دھوکہ دینا دراصل خدائے پاک کو دھوکہ دینا ہے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ [البقرہ:۱۵]

ترجمہ: اللہ ان سے استہزا فرماتا ہے۔

اعتراض: استہزا ہنسی مذاق کو کہا جاتا ہے، یہ ایک عیب ہے لہذا اللہ پاک کی طرف اس کی نسبت کرنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔

جواب: یقیناً اللہ پاک ہنسی مذاق اور تمام عیوب سے منزہ ہے، لیکن اس آیت کریمہ میں جزائے استہزا کو استہزا فرمایا ہے اور ایسے موقع پر جزا کو اسی فعل سے تعبیر کرنا عین فصاحت ہے، اس طرح ایک اور مقام پر قرآن پاک میں وارد ہے: ''وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا'' [الشوریٰ:۴۰]

ترجمہ: برائی کا بدلہ اسی کے برابر برائی ہے۔

یہاں یہ معنی نہیں ہے کہ کوئی برائی کرے تو اس کے بدلے میں برائی

کر کے اس کا بدلہ دیا جائے بلکہ اس کی جزا مراد ہے اسی طرح آیت مذکورہ میں بھی ہے۔

﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[البقرہ:۲۲]

ترجمہ: تو جان بوجھ کر اللہ کے لیے برابر والے نہ ٹھہراؤ۔

۵۔**اعتراض:** مشرکین یہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے بلکہ وہ تو یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ واقعی اللہ پاک کے اور بھی شریک اور ہم پلہ ہیں۔

جواب: اس آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ اے مشرکین تم جانتے تھے کہ یہ تمہارے معبودان باطلہ جن کو شریک ٹھہراتے ہو یہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں کسی بھی چیز پر قادر نہیں ہیں تو گویا کہ تم جان بوجھ کر اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا رہے ہو۔

۲۔ یا یہ کہ تم نے تورات وانجیل تو پڑھی ہے اوران کتابوں میں کہیں بھی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا جواز نہیں ہے۔

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾[البقرہ:۲۴]

ترجمہ: تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

۴۔**اعتراض:** اس آیت کریمہ میں لفظ نار کو الف لام کے ذریعہ معرفہ لائے، لیکن سورۂ تحریم میں لفظ نار کو نکرہ لائے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ﴾[التحریم:۶]

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔

تو اس میں کیا حکمت ہے کہ ایک جگہ معرفہ اور دوسری جگہ نکرہ ذکر کیا ہے؟

جواب: پہلی آیت میں منافقین کا ذکر ہے کہ وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رہیں گے ارشاد باری ہے: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ [النساء: ۱۴۵] کہ بیشک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہیں۔

لہذا نار کو اس آیت میں معرفہ لائے لام استغراق کے ذریعہ یا پھر "لام عہد ذہنی" کے ذریعہ اور معبود ہی منافقین ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ [البقرہ:۴۶]

ترجمہ: جنھیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا ہے۔

۷۔**اعتراض:** جب آیت کے پہلے ٹکڑے سے معنی مکمل ہو جا رہا ہے تو دوسرا ٹکڑا "وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" لانے کی کیا ضرورت ہے اور اس کو ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: اس آیت کریمہ میں "أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ" سے مراد ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس اپنی نیکیوں کا ثواب پائیں گے اور رب تعالیٰ نے صبر و نماز وغیرہ پر جو انعام کا وعدہ فرمایا وہ پائیں گے۔

جبکہ '' وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ '' سے مراد یہ ہے کہ وہ بعث بعد الموت پر یقین رکھتے ہیں تو اب تکرار ختم ہوگئی۔

''وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ''[البقرہ:٦٠]

ترجمہ: اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو۔

اعتراض: عثو اور فساد دونوں کا ایک ہی معنی ہے تو دونوں لفظوں کے ذکر میں کیا حکمت ہے؟ اب اس کا معنی یوں ہوا کہ زمین میں فساد پھیلاتے ہوئے فساد مت پھیلاؤ۔

جواب: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ زمین میں کفر کرکے فساد مت کرو، باقی گناہوں کے ذریعہ تو فساد پھیلا ہی رہے ہو۔

۲۔ تفسیر طبری میں ہے کہ ابو عالیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے تھے: '' ولا تسعوا في الأرض فسادا '' کہ زمین میں فساد کی کوشش نہ کرو۔

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ﴾ [البقرہ:٦١]

ترجمہ: اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم سے ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا۔

اعتراض: ان لوگوں کے لیے منّ اور سلویٰ دو کھانے اترتے تھے تو یہاں طعام واحد، یعنی ایک کھانا کیوں کہا جبکہ کھانے تو دو تھے؟

جواب: یہاں ایک قسم کا کھانا مراد ہے چونکہ ہمیشہ ایک قسم کا ہی کھانا اترتا تھا اگرچہ وہ دو چیزیں تھیں۔ اسی لیے آپ کی قوم نے کہا کہ ایک قسم کے کھانے پر صبر نہ کرسکیں گے۔

﴿ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ [البقرہ:٦١]

ترجمہ:اورانبیا کوناحق شہید کرتے ہیں۔

اعتراض:انبیائے کرام تو ناحق ہی شہید ہوتے ہیں۔ایسا ہر گزنہیں کہ کبھی کسی نبی نے ایسا جرم (العیاذ باللہ) کیا ہوجس کے سبب ان کوشہید کرنا صحیح اورحق ہو۔جب ایسا ہےتو بغیر الحق کی قید کا کیا فائدہ ہے؟

جواب : ا۔اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اعتقاد میں ناحق سمجھتے تھے اس کے باوجود وہ انبیائے کرام کوشہید کرتے تھے۔تو یہاں انھیں کے صیغہ کے ساتھ تصریح کی گئی تا کہ ان کی قباحت اور ظاہر و باہر ہوجائے۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ کبھی نبی کا شہید کرنا حق بھی ہوتا ہے۔جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری چلائی،پس اگر یہاں قتل ہونا پایا جاتا تو حق پایا جاتا۔

﴿ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ﴾ [البقرہ:٦٨]

ترجمہ:اس کے بیچ میں۔

اعتراض: لفظ ''بین'' دو یا دو سے زائد چیزوں کا تقاضا کرتا ہے، قرآن پاک میں آیا ہے۔

﴿ مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ ﴾[البقرہ:١٠٢]

ترجمہ:جس سے وہ جدائی ڈالیں مرد اوراس کی بیوی کے درمیان۔

جواب: یہاں ''عوان'' کی اضافت ''ذلك'' کی طرف کی گئی ہے۔

اور ''ذلك'' سے واحد، تثنیہ اور جمع سب کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ [یونس:۵۸]

ترجمہ: تم فرمادو اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت اور اسی پر چاہیے کہ خوشی منائیں۔

یہاں پر فضل اور رحمت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔لیکن اس کے باوجود صرف ''ذٰلک'' ہی ذکر کیا۔اسی طرح ''عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ'' میں بھی ماقبل کی دونوں چیزوں کی طرف اشارہ ہے اور اصل عبارت یہ ہے۔''عوان بين الفارض والبكر.

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ﴾ [البقرہ:۷۹]

ترجمہ: تو خرابی ہے ان کے لیے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں۔

اعتراض: کتاب تو ہاتھ سے ہی لکھی جاتی ہے پھر یہاں ''بِاَيْدِيْهِمْ'' ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: تورات میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا اور آپ کے اوصاف بیان کیے گئے تھے، جب آپ کی ولادت ہوئی تو روسائے یہود کو اندیشہ ہوا کہ اب ان کی روزی روٹی اور کمائی کا جو ذریعہ تھا وہ ختم ہوجائے گا، اس لیے انھوں نے تورات میں تحریف کردی۔لہذا ان کے اس فعل قبیح کو واضح طور پر بیان کرنے کے لیے ''بِاَيْدِيْهِمْ'' کا اضافہ کیا،

مثلاً: کہا جاتا ہے کہ فلاں نے یہ کام کیا، اور فلاں نے یہ کام اپنے ہاتھوں

سے کیا تو پہلے جملے کے بالمقابل دوسرے جملے میں زیادہ تاکید ہے۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ﴾
[البقرہ:۸۳]

ترجمہ: پھرتم پھر گئے مگرتم میں کے تھوڑے اورتم روگردان ہو۔

اعتراض: تولی اوراعراض دونوں ایک ہی معنی میں ہیں پھر دونوں کو ذکرکرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: ''ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ'' سے مراد ہے کہ تم نے اللہ پاک سے جو وعدہ کیا اس سے پھر گئے۔

تفسیر طبری میں ہے کہ اللہ پاک نے ان سے عہد لیا کر کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، والدین کے ساتھ حسن سلوک کریں، صلہ رحمی کریں، نماز وزکاۃ کی ادائیگی کریں لیکن انھوں نے مخالفت کی اور عہد شکنی کی۔

اور ''وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ'' سے مراد ہے کہ یہ سب کرنے کے بعد اس کے انجام کے بارے میں بھی غور وفکر نہیں کرتے ہو بلکہ انجام سے اعراض کرتے ہیں۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾[البقرہ:۹۶]

ترجمہ: اور بے شک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکین۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ''مِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا'' کے ذریعہ الگ سے مشرکین کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ ''وَلَتَجِدَنَّهُمْ'' میں مشرکین بھی داخل ہیں۔

جواب: مشرکین کا یہاں خصوصی طور پر ذکر کیا گیا اس لیے کہ یہ زندگی کے سب سے زیادہ حریص اور سب سے زیادہ خواہاں ہوتے ہیں۔ بعث بعد الموت پر بھی ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

﴿وَمَآ أُنزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ﴾

[البقرہ:۱۰۲]

ترجمہ: اور (جادو) جو بابل میں دو فرشتوں (ہاروت اور ماروت) پر اترا۔

اعتراض: اس سے معلوم ہوا کہ جادو حرام نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ فرشتوں پر اترا ہے۔

جواب: ہاں! جادو کا علم سیکھنا حرام نہیں بلکہ اگر کوئی اس نیت سے یہ علم سیکھے کہ لوگوں کی حفاظت کرے اور ان کو جادو سے بچائے تو یہ کار خیر بھی ہے۔ البتہ کسی پر جادو کرنا اور اس پر عمل کرنا ضرور حرام ہے، اور اس غرض سے جادو سیکھنا بھی ناجائز ہے۔

﴿وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾[البقرہ:۱۰۲]

ترجمہ: بے شک ضرور انھیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں، اور بے شک کیا ہی بری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں، کسی طرح انہیں علم ہوتا۔

اعتراض: اس آیت میں پہلے تاکید کے ساتھ کہا گیا کہ انھیں اس کا علم ہے اس کے بعد آخر میں علم کی نفی کر دی ہے ایسا کیوں، کہ پہلے علم کو تاکید کے ساتھ ثابت کیا اور پھر اس کی نفی کر دی۔

جواب: ۱۔ ابتدا میں علم کو ثابت کیا اس سے مراد یہ ہے کہ انھیں اجمالی طور پر یہ علم تھا کہ جس نے جادو کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اور آخر جس علم کی نفی کی گئی ہے اس سے اس کا تفصیلی علم اور حقیقت علم مراد ہے۔

۲۔ تفسیر طبری میں اسی آیت کی تفسیر میں ہے کہ پہلے علم کو ثابت کر کے بعد میں نفی کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جادو کا علم سیکھ کر اس پر عمل نہیں کیا تھا ۔اب چونکہ اصل عالم وہی ہے جو علم پر عمل کرے ورنہ بسا اوقات بے عمل عالم کو جاہل کہہ دیا جاتا ہے۔

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾[البقرہ:۱۰۳]

ترجمہ: اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے یہاں کا ثواب زیادہ اچھا ہے، کسی طرح وہ جانتے۔

اعتراض: جب دونوں چیزوں میں بھلائی ہو لیکن کمی بیشی ہو تب کہا جاتا ہے۔

’هذا خير من ذلك‘‘ کے یہ اس سے زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اس آیت کریمہ میں کیوں لفظ خیر کا استعمال کیا گیا جبکہ جادو میں تو کوئی بھلائی نہیں ہے۔

جواب: جو لوگ جادو سیکھتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ جادو ان کے لیے نفع بخش ہے، دنیوی فائدہ بھی ان کو حاصل ہوتا تھا، اس لیے قرآن پاک نے ان کے اعتقاد کے مطابق خطاب فرمایا۔

﴿ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴾ [البقرہ:۱۳۲]

ترجمہ: تو نہ مرنا مگر مسلمان۔

اعتراض: مرنا اور جینا انسان کے بس میں نہیں ہے، موت و زندگی تو اللہ پاک دیتا ہے تو یہاں بندوں کی طرف مرنے کی نسبت کیوں کی گئی؟

جواب: اس آیۃ کریمہ کے معنی یہ ہیں کہ اے ایمان والو! اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنا یہاں تک کہ تمہیں اسی حالت میں موت آجائے، تو یہاں اسلام پر ثابت قدمی کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ مرنے جینے کا اختیار۔

تفسیر طبری میں اسی آیت کی تفسیر میں ہے کہ ''دین اسلام پر ہی رہنا ذرا دیر کے لیے بھی اس کو مت چھوڑنا کیوں کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے پتہ نہیں کب اچانک موت آجائے''۔(ملخصاً)

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا﴾

[البقرہ:۱۳۷]

ترجمہ: اگر وہ ایمان لائے اس کے مثل پر جس پر تم ایمان لائے تو وہ ہدایت پا گئے۔

اعتراض: یہاں ''بہ'' سے اگر یہ مراد ہو کہ اللہ تعالیٰ کے مثل پر ایمان لائے تو یہ درست نہیں، کہ اللہ پاک کا کوئی مثل نہیں اور اگر دین حق اور دین اسلام مراد ہے تو بھی درست نہیں کہ اس کا بھی کوئی مثل نہیں ہے، تو پھر اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس آیت میں کلمہ مثل زائد ہے لہذا اعتراض ہی دفع ہو گیا، اور

''بہ'' سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے یا پھر دین اسلام پر ایمان لائے۔

قرآن پاک اور کلام عرب میں کئی مقامات پر لفظ مثل زائد ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾[الشوری:۱۱]

ترجمہ: اس جیسا کوئی نہیں۔

﴿كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ﴾[الانعام:۱۲۲]

ترجمہ: اس جیسا ہو جائے جو اندھیروں میں ہے۔

لہذا ان دونوں آیتوں میں بھی لفظ مثل زائد ہے۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ با ''زائدہ'' ہے اور معنی یہ ہے کہ تم اللہ پر یا دین اسلام پر ایمان لانے کی طرح ایمان لاؤ۔

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا﴾[البقرہ:۱۴۴]

ترجمہ: تو ضرور ہم تمہیں پھیر دیں گے اس قبلہ کی طرف جس میں تمہاری خوشی ہے

اعتراض: لفظ ''تَرْضٰىهَا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کے قبلہ ہونے پر راضی نہ تھے، حالانکہ یہ تو رب تبارک و تعالیٰ کا حکم تھا تو اس کے حکم پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کر راضی نہیں؟

جواب: یہاں رضا سے طبعی محبت مراد ہے، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع نہ کرنا۔ لہذا معنی یہ ہوا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی تو تھے لیکن آپ کے دل میں ایک طبعی خواہش اور محبت تھی کہ خانہ کعبہ ہی

قبلہ ہو جائے۔

﴿وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ﴾[البقرہ:۱۴۵]

ترجمہ: اور نہ تم ان (یہود ونصاری) کے قبلہ کی پیروی کرو۔

اعتراض: یہود اور نصاری دو الگ الگ قبیلے تھے اس اعتبار سے لفظ قِبْلَة تثنیہ آنا چاہیے جبکہ واحد کا صیغہ آیا ہے۔

جواب: یہود اور نصاری دونوں کے قبلے باطل اور مسلمانوں کے قبلہ کے خلاف تھے لہذا ابطلان ومخالفت میں دونوں ایک ہی حکم میں تھے۔ اس لیے واحد کا صیغہ ''قِبْلَتَهُمْ '' لایا گیا ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾[البقرہ:۱۶۱]

ترجمہ: بے شک وہ جنہوں نے کفر کیا اور کافر ہی مرے ان پر لعنت ہے اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی۔

اعتراض: اس سے ثابت ہوا کہ سبھی لوگ ان پر لعنت بھیجتے ہیں، جبکہ ایسا نہیں ہے، ان کے مذہب اور دین والے تو ان پر لعنت نہیں بھیجتے ہیں بلکہ وہ خود بھی کفر پر راضی ہیں اور دوسروں کو بھی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

جواب: ا۔ یہاں ناس سے صرف مومنین مراد ہیں اور سبھی مومنین ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔

۲۔ یا ناس سے سبھی لوگ مراد ہیں اور ان کے مذہب کے لوگ روز قیامت ان پر لعنت بھیجیں گے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضاً﴾[العنکبوت:۲۵]

ترجمہ: پھر قیامت کے دن تم میں سے ایک دوسرے کے ساتھ کفر کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت ڈالے گا۔

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾[العنکبوت:۲۵]

ترجمہ: اللہ قیامت کے دن ان سے بات نہ کرے گا۔

دوسرے مقام پر ہے:۔

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ، عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [الحجر:۹۳-۹۲]

ترجمہ: تو تمہارے رب کی قسم ہم ضرور ان سے پوچھیں گے جو کچھ وہ کرتے تھے۔

اعتراض: پہلی آیت کریمہ میں بتایا گیا کہ اللہ پاک قیامت کے دن کفار سے کلام نہیں فرمائے گا، دوسری آیت بتارہی ہے اللہ پاک ان سے کلام فرمائے گا۔

جواب: پہلی آیت میں کلام کی نفی کی گئی تو اس سے مراد ہے کہ اللہ پاک ان سے نرمی سے کلام نہ فرمائے گا جس طرح نرمی اور لطف کے ساتھ مومنین سے کلام فرمائے گا۔

دوسری آیت میں جو کلام کرنا بتایا گیا تو اس سے مراد ہے کہ اللہ پاک زجر وتوبیخ اور سختی کے ساتھ ان سے کلام فرمائے گا۔

۲۔ تفسیر قرطبی میں پہلی آیت کی تفسیر میں ہے: اس آیت سے مراد ہے کہ

اللہ پاک ان کے استقبال کے لیے فرشتے نہیں بھیجے گا۔

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی﴾
[البقرہ:۱۷۸]

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص فرض ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ ولی کو اختیار ہے کہ چاہے تو قصاص لے اور چاہے معاف کر دے۔

جواب: زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ آزادوں میں لڑائی ہوتی تو ایک کے بدلے دو کو قتل کرتے تھے، اور غلاموں میں لڑائی ہوتی تو غلام کے بجائے آزاد کو قتل کرتے تھے، اس آیت کریمہ میں اسی کا رد کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا کہ جو قتل کرے گا اسی کو قتل کیا جائے گا خواہ آزاد ہو یا غلام مرد ہو یا عورت۔

۲۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ قتل کرنے والے پر فرض ہے کہ خود کو مقتول کے اولیا کے حوالے کر دے، یہ مطلب نہیں ہے کہ مقتول کے اولیا پر فرض ہے کہ قاتل کو ڈھونڈ کر قتل کریں۔

﴿الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ [البقرہ:۱۸۰]

ترجمہ: وصیت کرے ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لیے۔

اعتراض: ''اَقْرَبِیْنَ'' کا عطف والدین پر کیا گیا ہے، عطف

مغایرت چاہتا ہے جبکہ والدین تو اقربین میں داخل ہیں بلکہ وہ تو اقرب الاقربین ہیں۔

جواب: والدین اقربین میں داخل نہیں ہیں اس لیے کہ اقرب یا قریب کا معنی ہے ایک انسان دوسرے سے کسی واسطے سے قریب ہو مثلاً بھائی چچا وغیرہ، لیکن اولاد والدین سے کسی واسطے کے سبب قریب نہیں بلکہ وہ تو والدین کا جز ہیں لہذا یہاں قرب کا یہ معنی نہیں پایا جائے گا اسی لیے والدین کا علیحدہ ذکر کیا ہے۔

۲۔اور اگر یہ مان لیا جائے کہ والدین بھی داخل ہیں تب بھی کوئی اشکال نہیں ہے کہ والدین کی عظمت وشرافت کے سبب ان کو خصوصی طور پر ذکر کر دیا گیا ہے۔

جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے۔﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾
[البقرہ:۹۸]

ترجمہ: جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا۔

اس آیت میں ملائکہ میں تو سب فرشتے شامل تھے لیکن حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی عظمت ورفعت کے لیے خصوصی طور پر ان کا ذکر کیا۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾[البقرہ:۱۸۳]

ترجمہ: اے ایمان والوں! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر فرض ہوئے تھے۔

اعتراض: امت محمدیہ کے روزے پچھلی امتوں سے مختلف ہیں، پھر پچھلی امتوں سے تشبیہ دینے سے کیا مراد ہے؟

جواب: یہاں فقط فرضیت میں تشبیہ دینا مراد ہے نہ کہ روزوں کے احوال وکیفیات میں۔ حکم ہوا کہ پچھلی امتوں پر روزے فرض تھے اسی طرح امت محمدیہ پر بھی روزے فرض ہیں۔

۲۔ ایک قول ہے کہ عدد میں تشبیہ دینا مراد ہے اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نصاری پر بھی بعینہ رمضان کے روزے فرض تھے۔

لیکن وہ ایسا کرتے تھے کہ جب روزے سخت گرمی میں آتے تو پیاس اور گرمی کی وجہ سے بوجھ محسوس کرتے اور جب سردی میں روزے آتے تو بھوک کی وجہ سے بار محسوس کرتے اس لیے انہوں نے روزوں کے لیے ربیع کا مہینہ منتخب کرلیا اور دس روزے اور بڑھا لیے تاکہ جو تقدیم وتاخیر کی، اس کی بھرپائی ہوجائے اوراس طرح چالیس روزے خود سے ہی مقرر کر لیے۔

﴿فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ [البقرہ:۱۸۳]

ترجمہ: میں دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول فرماتا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ ہیں جو دعائیں مانگتے ہیں لیکن قبول نہیں ہوتیں۔

جواب: دعا کے قبول ہونے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ بندہ جو دعا کرے وہ اسے مل جائے بلکہ قبولیت دعا کی کئی صورتیں ہیں کبھی فوراً دعا قبول ہو جاتی ہے تو کبھی مؤخر کر دی جاتی ہے اور کبھی تو آخرت کے لیے ہی موخر کر دی جاتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو دعا مانگی وہ نہیں ملتی ہے بلکہ اس کے عوض دعا مانگنے والے کی کوئی مصیبت ٹال دی جاتی ہے۔

لیکن دعا کے قبول ہونے کے لیے شرط ہے کہ بندہ مطیع وفرمابردار ہو، رزق حلال کھانے والا ہو، اور بوقت دعا دل بالکل صاف ہو۔

جب یہ شرائط پائے جائیں تو ضرور دعا قبول ہوتی ہے۔

جامع ترمذی کی حدیث پاک ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِن رَجُلٍ يَدْعُو اللهَ بِدُعَاءٍ إِلَّا اسْتُجِيبَ لَهُ، فَإِمَّا أَنْ يُعَجَّلَ فِي الدُّنْيَا، وَإِمَّا أَنْ يُدَّخَرَ لَهُ فِي الآخِرَةِ، وَإِمَّا أَنْ يُكَفَّرَ عَنْهُ مِنْ ذُنُوبِهِ بِقَدْرِ مَا دَعَا. (جامع الترمذی، رقم الحدیث: ۳۶۰۴)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بندہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو اس کی دعا مقبول ہوتی ہے، یا تو دنیا میں ہی پوری کر دی جاتی ہے، یا آخرت کے لیے بچا کر رکھ دی جاتی ہے یا اس دعا کی مقدار اس کے گناہ مٹا دیے جاتے ہیں۔

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ [البقرہ:۱۹۶]

ترجمہ: پھر جسے مقدور نہ ہو تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور

سات جب اپنے گھر پلٹ کر جاؤ، یہ پورے دس دن ہوئے۔

اعتراض: یہ تو بدیہی بات ہے کہ تین اور سات دس ہوتے ہیں پھر" عشرۃ" لانے کی کیا ضرورت ہے، اور عشرہ تو دس دن کا ہی ہوتا ہے پھر اس کے ساتھ لفظ کاملہ صفت ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: یہاں ''**عشرۃ کاملۃ**'' اس لیے ذکر کیا گیا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ آیت میں ''واؤ'' ''او'' کے معنی میں ہے، اس لیے کہ قرآن پاک میں ''واؤ'' ''او'' کے معنی میں بھی آیا ہے۔

سورۂ نساء میں ہے، ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ﴾ [النساء:۳]

ترجمہ: تو نکاح میں لاؤ جو عورتیں تمہیں خوش آئیں، دو دو، اور تین تین اور چار چار۔

اس آیت کریمہ میں ''واؤ'' ''او'' کے معنی میں ہے ورنہ تو لازم آئے گا کہ ایک ساتھ نو عورتیں نکاح میں رکھنا جائز ہو جائے، اسی طرح اس آیت کریمہ سے کوئی یہ گمان نہ کرے کہ دوران حج تین روزے رکھ لے یا پھر حج سے واپسی پر سات روزے رکھ لے لیکن ''**عشرۃ کاملۃ**'' لا کر کے یہ وہم دور کر دیا اور بتا دیا کہ یہاں پورے دس دن مراد ہیں۔

رہا یہ اعتراض کہ جب عشرہ دس دن کا ہی ہوتا ہے تو ''**کاملۃ**'' صفت لانے کی کیا ضرورت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''**کاملۃ**'' تاکید کے لیے لایا گیا ہے جس طرح حولین کے صفت کاملین لائی گئی ہے۔

﴿فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ﴾ [البقرہ:۱۹۸]

ترجمہ: پس جب عرفات سے لوٹو تو اللہ کو یاد کرو مشعر حرام کے پاس اور اس کا ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ''فاذکرو اللہ'' ذکر کرنے کے بعد دوبارہ ''واذکروہ'' لانے کا کیا فائدہ؟

جواب: یہاں دوبار لفظ **ذکر** کو لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عرفات اور اس کے علاوہ مقدس مقامات میں صرف ایک بار ذکر کر کے خاموش نہیں ہو جانا ہے بلکہ ہر وقت ذکر میں مصروف رہنا ہے کہ یہ قبولیت دعا کی گھڑی ہے اس لیے سب کچھ ترک کر کے ذکر واذکار، اور توبہ استغفار میں لگے رہنا ہے۔

اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دعا و استغفار کے لیے یہ وقت بالکل فارغ کر دیا گیا ہے حتی کے عصر کی نماز بھی اس کے وقت سے ہٹا کر ظہر میں پڑھنے کا حکم دیا گیا کہ بندہ بالکل دعا کے لیے خود کو فارغ کر لے۔

فائدہ: عرفات ایک مقام کا نام ہے جہاں حجاج کرام ٹھہرا کرتے ہے۔

ضحاک کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا رضی اللہ عنہا جدائی کے بعد ۹، ذی الحجہ کو مقام عرفات پر جمع ہوئے اور آپس میں تعارف ہوا اسی لیے اس دن کو عرفہ اور مقام کو عرفات کہتے ہیں۔ اور مشعر حرام جبل قزح ہے جس پر امام وقوف کرتا ہے۔

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ

فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ﴿﴾
[البقرہ:۲۱۵]

ترجمہ: تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، تم فرما دو کہ جو کچھ مال نیکی میں خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور راہ گیر کے لیے ہے۔

اعتراض: یہاں سوال تو یہ ہوا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ لیکن جواب میں خرچ کرنے کے مصارف بیان کیے تو جواب سوال کے موافق کہاں ہوا؟

جواب: آیت کریمہ میں جو سوال ہوا کہ کیا خرچ کریں تو اس کا جواب ''مَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ'' میں ہو گیا کہ ہر خیر کی چیز خرچ کرو، اس کے بعد مزید اضافہ کیا تو مصارف کو بھی بیان فرما دیا۔

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا جواب دیا، اور اس کے بعد مزید اضافہ کر کے اس کا مقصد بھی بتا دیا۔

۲۔ تفسیر قرطبی میں اسی آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ذکر ہے کہ صحابہ کرام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اپنے مال کو کہاں خرچ کریں اسی لیے مصارف کا ذکر کیا گیا۔

۳۔ تفسیر بغوی میں زیر آیت ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت عمرو بن جموح کے بارے میں نازل ہوئی جو نہایت ضعیف اور مال دار تھے، پس انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہم کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور اس میں دونوں سوالوں کے جواب دیے گئے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّىۡ وَ مَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ﴾ [البقرہ:۲۴۹]

ترجمہ: اللہ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے پس جو اس کا پانی پیے وہ میرا نہیں اور جو نہ پیے وہ میرا ہے۔

اعتراض یہاں پانی پینے کے لیے لفظ ''لم یطعم'' فرمایا جو کہ کھانے کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ پانی پیا جاتا ہے کہ وہ پینے کی چیز ہے نہ کہ کھانے کی چیز ہے۔

جواب: یہاں'' طعم'' ذاق کے معنی میں ہے اس لیے کہ لفظ'' طعم'' کھانے اور ذائقہ دونوں کے لیے مستعمل ہے۔

تفسیر طبری میں زیر آیت ہے: ومعنی قوله'' لم یطعمه''''لم یذقه''

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہاں ''لم یشرب'' نہیں آیا بلکہ ''لم یطعم'' آیا اس لیے کہ ''شرب'' کا لفظ ایک بار لے آئے ہیں اور اہل عرب کی عادت ہے کہ جب کسی بات کی تکرار کرتے ہیں تو ایک دوسرے لفظ کے ساتھ کرتے ہیں وہی لفظ نہیں لاتے ہیں، اور قرآن پاک تو افصح العرب ہے تو اس میں اس کی رعایت بدرجۂ اولیٰ ہوگی۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ‌ؕ وَ الۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾[البقرہ:۲۵۴]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ کرو وہ دن آنے سے پہلے جس میں نہ خرید وفروخت ہے، نہ دوستی اور نہ شفاعت اور کافر خود ظالم ہیں۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرے گا کہ لفظ "**لا شفاعة**" مطلقاً انکار کر رہا ہے، وہیں دوسری طرف کئی آیات قرآنیہ شفاعت کے ثبوت کو بتا رہی ہیں تب دونوں میں تطبیق کیسے ممکن ہوگی؟

جواب: یہ آیت عام ہے لیکن مراد خاص ہے اور وہ کفار ہیں کہ روز قیامت ان کی کوئی شفاعت وسفارش نہیں کرے گا، جن بتوں کو پوجتے تھے اور ان سے شفاعت کی لو لگائے تھے وہ بھی کفار کی شفاعت نہیں کریں گے۔ اس آیت میں کفار کو مراد لینے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ آگے فرمایا "**وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ**" یہاں دوستی کی بھی نفی کی ہے جبکہ مومنین و متقین کو دوستی بھی کام آئے گی خود اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے۔ "**اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ**"۔[الزخرف:٦٧]

ترجمہ: گہرے دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار۔

اس آیت میں بتایا کہ مومنین کے لیے روز قیامت دوستی کام آئے گی اسی طرح شفاعت بھی۔

﴿وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾[البقرہ:٢٥٤]

ترجمہ: کافر ہی ظالم ہیں۔

اعتراض: یہاں ظلم کو کفار میں ہی کیوں منحصر کیا؟ حالانکہ کفار کے علاوہ مومنین بھی ظالم ہیں۔

جواب: کفار کا ظلم زیادہ سخت ہے اس لیے حصر کر دیا گویا کہ ان کے سوا کوئی ظالم ہی نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ سے علما ڈرتے ہیں اور دیگر مومنین بھی ڈرتے ہیں البتہ علما زیادہ ڈرتے ہیں تو ان کے بارے میں کہا گیا کہ صرف علما ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ''

یعنی اللہ تعالیٰ سے علما ہی ڈرتے ہیں۔

عطاء بن دینار نے فرمایا:

الحمد لله الذی قال:والكافرون هم الظالمون ولم يقل:والظالمون هم الكافرون.[قرطبی:۲۶]

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے فرمایا: کافر ہی ظالم ہیں اور یہ نہیں فرمایا کہ ظالم ہی کافر ہیں۔

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ [البقرہ:۲۵۷]

ترجمہ: اللہ والی ہے مسلمانوں کا انہیں اندھیروں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔

اعتراض: یہاں مراد ہے کہ کفر کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی

طرف نکالتا ہے، لیکن مؤمنین تو ایمان لے آئے تو مضارع کا صیغہ کیوں لایا گیا جبکہ فعل واقع ہو چکا ہے۔

جواب: مضارع کا صیغہ ''یخرج'' اس لیے لایا گیا کہ یہاں استمرار پر دلالت ہو۔

اب اگر مومنین کے حق میں مانا جائے تو معنی یہ ہوا کہ اللہ پاک ان کے شبہات کو دور فرما کر اور ان کی ہدایت میں اضافہ فرما کر ان کو مزید روشنی کی طرف نکالتا ہے، اور اگر ان کے حق میں مانا جائے جو ابھی تک ایمان نہیں لائے اور ان کی تقدیر میں ایمان لانا ہے تو معنی واضح ہے کہ انہیں ایمان کی دولت عطا فرما کر کفر کی تاریکیوں سے نکالتا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ﴾ [البقرہ:۲۵۷]

ترجمہ: اور کافروں کے حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں نور سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔

اعتراض: کفار کونسے نور میں تھے کہ انھیں شیطان تاریکیوں کی طرف نکالتے ہیں کفر میں تو ابتدا تا انتہا تاریکی ہی تاریکی ہے تب کفار کے لیے نور سے تاریکی کی طرف نکلنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ۱۔ اس آیت کریمہ میں اگر کفار سے مرتدین مراد ہیں تب تو ظاہر ہے کہ وہ ایمان کی روشنی سے کفر کی تاریکی میں داخل ہو رہے ہیں۔

۲۔ اگر کفار قدیمی مراد ہیں تب مراد نور اسلام ہے جو میثاق کے دن

حاصل ہوا تھا جو اصل فطرت ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ ''کُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ''

ترجمہ: ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

۳۔ تفسیر بغوی میں زیر آیت ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر قبل بعثت ایمان رکھتے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف دیکھے اور پڑھے تھے لیکن جب آپ کی بعثت ہوئی تو یہود کفر کر بیٹھے اور ایمان کی روشنی سے نکل کر کفر کی تاریکیوں میں داخل ہو گئے۔

﴿قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ﴾[البقرہ:۲۶۰]

ترجمہ: فرمایا: تو چار پرندے لے اور اپنے ساتھ ہلا لے۔

اعتراض: یہاں'' فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ''لانے کا کیا فائدہ ہے جبکہ ''فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ'' سے بات پوری ہو رہی ہے۔

جواب: یہاں ''فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ'' سے یہ بتانا ہے کہ اے ابراہیم! پرندوں کو لیکر اپنے ساتھ خوب مانوس کرلو، ان کی شکل وصورت کو خود پہچان لو تاکہ جب دوبارہ زندہ ہوں تو تم پر اشتباہ نہ ہو جائے اور یہ وہم نہ ہو کہ یہ دوسرے پرندے ہیں۔

﴿أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ﴾

[البقرہ:۲۶۶]

ترجمہ: کیا تم میں سے کوئی اسے پسند کرے گا کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا۔

اعتراض: باغ میں ہر قسم کے پھل اور میوے ہوتے ہیں خود اسی آیت کے ایک جز ''فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ'' یعنی اس میں ہر قسم کے پھل ہوں- سے اس کی صراحت ہوتی ہے، پھر اس میں کھجور اور انگور کے درخت کو ہی ذکر کیوں کیا؟

جواب: ہاں! باغ میں سبھی قسم کے میووں کے درخت ہوں گے، لیکن کھجور اور انگور کے درختوں کو اس لیے خاص کیا کہ یہ سب سے نفیس اور عمدہ میوے مانے جاتے ہیں یا یہ سب سے زیادہ نفع بخش ہوتے ہیں اور ان کے درخت سب سے زیادہ ہوں گے اس لیے غلبہ کے طور پر ان دونوں درختوں کا ذکر کر دیا گیا۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾ [البقرہ:۲۷۵]

ترجمہ: وہ جو سود کھاتے ہیں۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ان کی مذمت آئی ہے جو سود کا مال کھاتے ہیں، تو سود کا مال کھانا ہی گناہ نہیں ہے بلکہ اس مال سے لباس پہننا، اس کو اپنے پاس جمع کر کے رکھنا، یا کسی کو وہ مال ہبہ کرنا ان سب کا گناہ برابر ہے پھر بھی صرف کھانے کے ساتھ ہی مذمت کو خاص کیوں کیا؟

جواب: مال و دولت کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ بندہ شکم سیر ہو، کھائے پیے، اس سے بے نیازی بھی نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی سب بڑی اور سب سے

اہم ضرورت ہے جس کے بغیر چارہ نہیں ہے اسی لیے کھانے کا ذکر خصوصی طور پر کر دیا گیا اگرچہ کسی بھی طریقہ سے سود کے مال کو استعمال کرے گناہ برابر ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ [البقرہ:۲۷۵]

ترجمہ: اس لیے کہ انھوں نے کہا بیع بھی سود کے مانند ہے۔

اعتراض: جب ربا (سود) کی بات چل رہی ہے اور مقصد یہ ہے کہ ربا کو بیع سے تشبیہ دینا۔ تب یہ کہنا چاہیے ''انما الربوا مثل البیع'' جبکہ آیت میں اس کے برعکس ہے۔

جواب: یہاں تشبیہ میں مبالغہ کرنا مقصود ہے چونکہ انھوں نے اپنے اعتقاد میں ربا کو اس قدر مباح وحلال سمجھ لیا تھا کہ ربا کو اصل اور بیع کو فرع کا درجہ دے دیا تھا، جیسا کہ مبالغہ کے طور پر کہا جاتا ہے: ''القمر کوجه زید'' یعنی چاند زید کے چہرہ کی مانند ہے۔

۲۔ یہاں تشبیہ دینا یا ایک دوسرے پر قیاس کرنا مراد نہیں ہے بلکہ کفار نے احکام الٰہیہ پر اعتراض کیا ہے کہ جس طرح بیع ہوتی ہے اسی طرح ربا بھی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام کیوں کر دیا؟ اگر قیاس کرنا یا تشبیہ دینا ہی مراد ہوتا تو کفار یوں کہتے'' انما الربوا مثل البیع'' یعنی ربا (سود) بیع کی طرح ہے۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ﴾

[البقرہ:۲۷۵]

ترجمہ: اور جو پھر سے ایسی حرکتیں کرے گا تو وہ دوزخی ہے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں بتایا گیا کہ جو سود کھائے گا وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا حالانکہ سود کھانا گناہ کبیرہ ہے اور مرتکب گناہ کبیرہ کے لیے دخول فی النار ہے ''خلود فی النار'' نہیں۔

جواب: یہاں مراد یہ ہے کہ جس نے حلال سمجھ کر سود کھایا تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا چونکہ ربا کی حرمت پر نص وارد ہے اب کوئی حلال جان کر سود کھالے تو کافر ہو جائے گا اور کافر ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

۲۔خلود کا اطلاق کبھی طول بقا اور عرصہ دراز پر بھی ہوتا ہے اور یہاں وہی مراد ہے کہ سود کھانے والے ایک لمبے عرصہ تک دوزخ میں جلیں گے۔

تفسیر بغوی میں زیر آیت ہے: او من عاد بعد التحریم إلی أکل الربا مستحلا له﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ﴾

ترجمہ: سود کی حرمت کے بعد اگر دوبارہ کسی نے حلال جان کر کھایا تو وہ دوزخی ہے اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ﴾

[البقرہ:۲۸۳]

ترجمہ: اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو (قرض خواہ کے) قبضے میں گروی چیز ہو۔

اعتراض: یہاں رہن کو شرط اور جواب شرط کے طور پر اس طرح ذکر کیا جیسے رہن کا جواز سفر کے ساتھ خاص ہو حالانکہ حضر میں بھی رہن کا جواز ثابت ہے۔

جواب: تفسیر قرطبی میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ سفر میں رہن کا جواز نص قرآنی سے ثابت ہے اور حضر میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اگر چہ معنوی طور پر آیت قرآنی سے بھی حضر میں جائز ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

۲۔ یا یہاں سفر کے ساتھ بطور شرط خاص نہ کیا بلکہ سفر میں خاص طور سے کاتب اور شاہد وغیرہ کی حاجت درپیش ہوتی ہے اس لیے یہاں ذکر کر دیا گیا ہے، گویا کہ یہ قید اتفاقی ہے نہ کہ احترازی۔

﴿وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ﴾[البقرہ: ۲۸۴]

ترجمہ: اور جو کچھ تمہارے دل میں ہے اگر تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔

اعتراض: انسان کے دل میں جو خیالات اور وسوسے آتے ہیں ان پر مواخذہ نہیں ہوگا اس لیے کہ ان سے بچنا ممکن نہیں ہے، اور بندہ اسی کا مکلف ہے جو اس کی وسعت میں ہو، اور بخاری و مسلم کی حدیث پاک سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے دلوں میں جو وسوسے گزرتے ہیں اللہ پاک ان سے تجاوز فرماتا ہے، جب تک وہ اس پر عمل نہ کرے یا وسوسوں کے ساتھ متفق نہ ہو۔

اس آیت کریمہ میں صاف صاف کہا گیا کہ بندے کے دل میں جو

خیالات و وسوسے گزرتے ہیں اللہ پاک ان کا بھی حساب فرمائے گا۔

جواب: ١۔اس آیت میں عموم ہے چنانچہ پہلے یہ حکم تھا پھر بعد میں منسوخ ہو گیا اور اس کے لیے ناسخ یہ آیت ہے: ’’**لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا**‘‘ [البقرہ:٢٨٦] کہ اللہ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہے۔

یہ قول حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابوہریرہ، امام شعبی، عطا، محمد بن سیرین، محمد بن کعب، موسیٰ بن عبیدہ اور اس کے علاوہ صحابہ کرام و تابعین عظام کی ایک جماعت کا ہے انہوں نے فرمایا کہ یہ حکم ایک سال تک باقی رہا اس کے بعد منسوخ ہو گیا۔

٢۔ایک قول یہ ہے کہ یہ خبر ہے اور خبر منسوخ نہیں ہوتی ہے، لیکن اس سے عمومی طور پر تمام خیالات اور وسوسے مراد نہیں ہیں بلکہ وہی مراد ہیں جن سے بچنا بندہ کی طاقت میں ہے اور اس سے مراد وہ خیالات ہیں جن کو بندہ اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور ان کو کرنے کا عزم رکھتا ہے لہذا ان پر مواخذہ ہو گا۔

٣۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت کریمہ عام ہے اللہ پاک روز قیامت مخلوق کے تمام اعمال کا حساب فرمائے گا جو انہوں نے اعمال کیے یا جو ان دلوں میں خیالات و وسوسے گزرے پھر مؤمنین کے خیالات والے اعمال کو معاف فرما دے گا اور کفار اور منافقین کا حساب لے گا۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ [البقرہ:٢٨٥]

ترجمہ: ہم ان میں سے کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔

اعتراض: لفظ بین دو یا دو سے زائد چیزوں کی طرف مضاف ہوتا ہے جبکہ اس آیت میں صرف ایک چیز (لفظ احد) کی طرف مضاف ہے۔

جواب: لفظ احد یہاں آحاد یعنی جمع کے معنی میں ہے تو مطلب یہ ہوا کے ''**لا نفرق بین آحاد من رسله**'' لہٰذا اب لفظ بین کا جمع کی طرف مضاف ہونا درست مانا جائے گا۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ لفظ ''احد'' واحد، تثنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کی صلاحیت رکھتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ لَسۡتُنَّ كَأَحَدٖ مِّنَ ٱلنِّسَآءِ ﴾ [الاحزاب:۳۲]

ترجمہ: اے نبی کی بیبیو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا مَا ٱكۡتَسَبَتۡۗ﴾ [البقرہ:۲۸۶]

ترجمہ: اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی۔

اعتراض: یہاں کونسی دلیل ہے جو اس بات کو بتاتی ہے کہ كَسَبَتۡ خیر اور فائدے کے لیے اور ''ٱكۡتَسَبَتۡ'' شر اور نقصان کے لیے ہے۔

جواب: ۱۔ایک قول یہ ہے کہ کسب خیر اور فائدہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ''اکتسب'' شر اور برائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

لیکن یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے اس لیے کہ قرآن پاک میں دونوں ایک دوسرے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

مثلاً سورہ نساء میں ہے:

﴿وَمَن يَكۡسِبۡ خَطِيٓـَٔةً أَوۡ إِثۡمٗا﴾ [النساء:۱۱۲]

ترجمہ: اور جو کوئی خطا یا گناہ کمائے۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ﴾ [مدثر:۳۸]

ترجمہ: ہر جان اپنی کرنی (اعمال) میں گروی ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ''لام'' خیر و انتفاع کے لیے ہے اور ''علیٰ'' شر اور برائی کے لیے ہے اس لیے اول پر لام داخل ہے تو اس سے خیر مراد ہے اور دوم پر علی داخل ہے تو اس سے برائی مراد ہے۔

لیکن یہ دلیل بھی کافی نہیں چونکہ قرآن پاک میں اس کے برعکس بھی آیا ہے مثلاً:

﴿أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ﴾ [الرعد:۲۵]

ترجمہ: ان کا حصہ لعنت ہوا ہے اور ان کا نصیبہ برا گھر ہے۔

﴿إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا﴾ [الاسراء:۷]

ترجمہ: تم اگر بھلائی کرو گے تو اپنا بھلا کرو گے، اور اگر برا کرو گے تو اپنا۔

اب غور کرو کہ پہلی آیت میں ''لام'' دونوں مقام پر برائی کے لیے استعمال ہوا اور دوسری آیت میں پہلے خیر کے لیے اور پھر وہی ''لام'' شر کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالباً ایسا ہوتا ہے کہ لام انتفاع و خیر کے لیے مستعمل ہے اور ''علی'' برائی اور شر کے لیے اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورۃ آل عمران

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ﴾ [آل عمران:۳]

ترجمہ: اس نے تم پر یہ سچی کتاب اتاری، اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتی اور اس نے اس سے پہلے توریت وانجیل اتاری۔

اعتراض: جب نزول قرآن کا ذکر فرمایا تو ''نَزَّلَ'' فرمایا لیکن جب توریت وانجیل کے نزول کا ذکر فرمایا تو ''اَنْزَلَ'' فرمایا اس میں کیا حکمت ہے اور ''نَزَّلَ'' اور ''اَنْزَلَ'' میں کیا فرق ہے؟

جواب: ا۔ ''نَزَّلَ'' کے معنی ہیں آہستہ آہستہ اتارنا، قرآن مجید آہستہ آہستہ نازل کیا گیا اس لیے قرآن پاک کے لیے ''نَزَّلَ'' فرمایا۔ اور توریت و انجیل یکبارگی نازل ہوئیں اس لیے ان کے لیے ''اَنْزَلَ'' فرمایا گیا کہ ''اَنْزَلَ'' کا معنی ہے یکبارگی نازل کرنا۔

لیکن اب اعتراض یہ ہوگا کہ قرآن پاک میں ہے ''وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ'' یہاں ''اَنْزَلَ'' فرمایا اور فرقان سے مراد قرآن ہے۔ [آل عمران:۴]

اس کے جواب میں صاحبِ کشاف زمخشری نے کہا کہ یہاں فرقان سے جنس کتب سماویہ مراد ہیں یا پھر اس سے زبور مراد ہے۔

لیکن اعتراض دفع نہ ہوا چونکہ کئی مقامات پر قرآن پاک کے لیے ''اَنْزَلَ'' کا صیغہ آیا ہے۔

مثلاً:﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ﴾
[آل عمران:۷]

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾
[البقرہ:۴]

ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم مراد ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ''نَزَلَ'' فعل لازم ہے، اور اس کو متعدی بنانے کے لیے ''نَزَّلَ'' اور'' اَنزَلَ'' دونوں بابوں میں استعمال کیا گیا ہے تب ''اَنزَلَ'' اور ''نَزَّلَ'' دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

اہل عرب کی عادت ہے کہ ایک کلام کو مختلف انداز میں لاتے ہیں اور قرآن پاک تو افصح العرب ہے، اس لیے مختلف صیغوں کا ذکر کیا ہے، اس کی تائید خود ارشاد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے۔

سورہ انعام میں ہے:﴿ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ﴾
[الانعام:۳۷]

ترجمہ: ان پر ان کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی۔

اور یہی آیت سورہ یونس میں ''اَنْزَلَ'' کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

﴿لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ﴾ [یونس:۲۰]

﴿هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ ﴾ [آل عمران:۷]

ترجمہ: وہی ہے جس نے تم پر کتاب اتاری، اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں۔

اعتراض: یہاں بتایا گیا کہ قرآن پاک کی بعض آیتیں محکم ہیں اور بعض مشابہ ہیں، لیکن سورہ ہود میں ہے:

﴿كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ﴾ [هود:۱]

ترجمہ: یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں محکم ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک کی تمام آیتیں محکم ہیں، اسی پر بس نہیں، بلکہ سورہ زمر میں یوں آیا ہے۔

﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا ﴾[الزمر:۲۳]

ترجمہ: اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب جو متشابہ ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے قرآن کی سب آیتیں متشابہ ہیں۔

جواب: امام عبد العظیم زرقانی ''مناهل العرفان فی علوم القرآن ''میں فرماتے ہیں کہ ان تینوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے کہ پہلی آیت کریمہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن پاک کی بعض آیات محکم ہیں یعنی ان کی دلالت مراد باری تعالیٰ پر واضح ہے اور بعض کی مراد واضح نہیں ہے، لہذا وہ متشابہ ہیں۔

دوسری آیت کریمہ کا معنی ہے: ''كِتابٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُه '' کہ قرآن پاک کی تمام آیتیں محکم ومضبوط ہیں ان میں لفظی یا معنوی کسی طرح کا کوئی بھی خلل نہیں ہے گویا کہ وہ محکم ومضبوط اور پختہ عمارت کی مانند ہے کہ باطل آگے یا پیچھے کہیں سے نہیں آسکتا ہے۔

ارشاد باری ہے: ﴿لَّا يَأۡتِيهِ الۡبَاطِلُ مِن بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ

خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾[حم السجدة:۴۲]

ترجمہ: باطل کو اس کی طرف راہ نہیں، نہ اس کے آگے سے، نہ اس کے پیچھے سے، اتارا ہوا ہے حکمت والے سب خوبیوں سراہے کا۔

تیسری آیت کا معنی یہ ہے: قرآن پاک کی تمام آیتیں احکام، حسن ولطافت اور الفاظ و معانی میں، اور ان میں اِعجاز کے پائے جانے میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں کہ حسن و بلاغت اور احکام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا ہے۔

اعتراض: آیات متشابہات کا کیا فائدہ ہے؟ چونکہ قرآن پاک تو ہدایت کے لیے نازل ہوا اور اسے روشن بیان کیا گیا ہے جبکہ آیات متشابہات کی مراد ہی معلوم نہیں ہے تو ان کا کیا فائدہ ہے بلکہ یہ تو ہدایت کے منافی ہیں۔

جواب: آیات متشابہات کے نزول کی بہت سی حکمتیں ہیں۔ چند درج ذیل ہیں۔

ا۔قرآن پاک عرب میں نازل ہوا اور ان کی ہی زبان میں نازل ہوا، اہل عرب کے کلام میں مجاز، کنایہ، اختصار، اشارہ، تاکید پائی جاتی ہے اس لیے ان کے کلام کے معانی سمجھنے میں پوشیدگی پائی جاتی ہے کہ ہر کوئی ہر بات نہیں سمجھ سکتا ہے اسی طرح قرآن پاک میں یہ سب باریکیاں پائی جاتی ہیں اور ان امور سے کلام میں حسن پیدا ہوجاتا ہے، قرآن کریم فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہے کہ یہ افصح العرب نبی علیہ السلام پر نازل ہوا ہے۔ اگر

قرآن مکمل ظاہر و باہر ہوتا تب تو اس کی معرفت میں عالم و جاہل سب برابر ہو جاتے اور ان میں آپس میں کوئی تفاضل نہ پایا جاتا۔لیکن اس میں غموض وخفا اور متشابیات کا پایا جانا علما کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس میں غور وفکر کریں اور اس کی مراد کو سمجھیں، اس کے اسرار ورموز سے آگاہ ہوں تاکہ اللہ پاک اور اس کے کلام سے اور بھی تقرب حاصل ہو اور عوام کے مابین بھی یہ قرآن کی معرفت رکھنے والے ممتاز رہیں۔

۲۔ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر قرآن پاک مکمل طور پر محکم ہوتا اور اس میں کسی طرح کا کوئی بھی تشابہ یا غموض نہ پایا جاتا تب یہ صرف ایک مذہب کے موافق ہوتا اور باقی مذاہب کی صراحتًا تردید کرتا کہ دیگر مذاہب کے لوگ اس کلام سے متنفر ہو جاتے ،اس کو قبول نہ کرتے اس میں غور وفکر نہ کرتے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی فائدہ حاصل کرتے۔

لیکن جب اس کلام میں محکم ومتشابہ ظہور وخفا دونوں طرح کی آیات ہیں تو ہر مذہب والے کو خیال آیا کہ اس میں تو اس مذہب کی بھی تائید ہوتی ہے اور اس سے اس کے افکار ونظریات میں مدد ملتی ہے اس لیے تمام مذاہب کے لوگ اس میں غور فکر کرتے ہیں اور اس کے معانی و مفاہیم کو مکمل طور سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اب وہ حق جان لیتے ہیں اور اپنے باطل نظریات سے حق کی طرف لوٹ آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک بار بار اس میں غور وفکر کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ﴾ [النساء:۸۲]

ترجمہ: تو کیا قرآن میں غور نہیں کرتے؟

۳۔قرآن پاک میں آیات متشابہات کی ایک عمدہ حکمت یہ بھی ہے کہ اہل علم ان کے معانی ومفاہیم کو سمجھیں، ان کی عمدہ تاویلیں کریں، بعض کو بعض پر ترجیح دیں، یہ سب امورانجام دینے کے لیے دیگر علوم کی ضرورت درپیش ہوئی جس کے نتیجہ میں علم تفسیر، اصول تفسیر، علم لغت، علم معانی و بیان وغیرہ وجود میں آئے جن کے بے شمار فائدے ہیں۔اگر قرآن پاک میں آیاتِ متشابہات نہ ہوتیں تو یہ علوم وجود میں نہ آپاتے۔

﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ [آل عمران:۱۸]

ترجمہ: اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہوکر، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عزت والا حکمت والا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ''لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ'' مکرّر لانے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ''لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ'' یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قول ہے اور دوسرا والا قول ملائکہ اور ''اولو العلم'' کا ہے جو بطور حکایت بیان کیا گیا ہے۔

۲۔امام جعفر صادق نے فرمایا: اول وصف ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور دوم میں تعلیم دی گئی کہ تم بھی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

﴿تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ﴾ [آل عمران:٢٧]

ترجمہ: تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔

اعتراض: کسی چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا اسی وقت پایا جائے گا جب ان دونوں کا بعد دخول اجتماع ممکن ہو مثلاً سوئی میں دھاگہ، انگلی میں انگھوٹھی، لیکن دن ورات میں تو تضاد پایا جاتا ہے تو ان کا اجتماع ممکن ہی نہیں ہے کہ دخول پایا جائے۔

جواب: ا۔ یہاں شب وروز کے آپس میں دخول سے مراد یہ ہے:

سردیوں میں رات لمبی ہوتی ہے اور دن چھوٹا، جبکہ گرمیوں میں دن لمبا ہوتا ہے اور رات چھوٹی ۔

۲۔ یا دخول سے یہ مراد ہے کہ ایک جگہ دن ہوتا ہے اسی وقت دوسری جگہ رات ہوتی ہے، کہیں صبح ہوتی ہے تو اسی وقت کہیں شام ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رات کا جو حصہ کم ہوتا ہے وہ دن میں داخل ہو جاتا ہے اور دن کا جو حصہ کم ہوتا ہے وہ رات میں داخل ہو جاتا ہے، اور آیت کریمہ سے یہی مراد ہے۔ مثلاً گرمیوں میں دن پندرہ گھنٹے کا ہوتا ہے اور رات نو گھنٹے کی تو اس حساب سے رات کے تین گھنٹے دن میں داخل ہو گئے اسی طرح سردیوں میں جب رات پندرہ گھنٹے کی ہوتی ہے اور دن نو گھنٹے کا ہوتا ہے تو دن کے تین گھنٹے رات میں داخل ہو گئے۔

﴿ لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ ﴾ [آل عمران:۳٦]

ترجمہ: لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا ہے۔

اعتراض: ا۔ یہ تو امر بدیہی ہے کہ لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا ہے لیکن یہاں اس کے ذکر کا کیا فائدہ ہے؟

۲۔ جب ایک چیز کو دوسری سے چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے تو اصول یہ ہے کہ حرف نفی قاصر پر داخل میں ہوتا ہے اور حرف تشبیہ کامل پر لیکن ''لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ'' میں اس کے برعکس ہے اصول کے اعتبار یوں ہونا چاہیے''لَيْسَ الْأُنثَىٰ كالذَّكَرُ''۔

جواب: ا۔حضرت حنہ رضی اللہ عنہا نے نذر مانی تھی کہ لڑکا ہوگا اور اس کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے رکھ دیں گے۔ لیکن آپ کے گمان کے برعکس ہوا اور لڑکی پیدا ہوئی تب آپ نے بطور اعتذار کہا، چونکہ آپ کو غم ہوا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے لہذا اب نذر کس طرح پوری ہو سکے گی،اس لیے کہ بیت المقدس کی خدمت جو لڑکا کر سکتا ہے وہ ایک لڑکی انجام نہیں دے سکتی ہے۔

۲۔تشبیہ میں جب فرع کو اصل کے درجے میں اور اصل کو فرع کے درجے میں رکھ دیا جائے تو ان پر اسی اعتبار سے حکم لگے گا جس درجہ میں اب رکھ دیا ہے مثلاً: اسی آیت میں تشبیہ میں مبالغہ کرنے کے لیے ذکر کو''انثی'' اور ''انثی''کو''ذکر''کے درجہ میں رکھ دیا اسی وجہ سے انثی پر حرف تشبیہ اور ذکر پر حرف ناقص داخل کیا ہے۔جیسے کہا جاتا ہے'' القمر کو جه زيد ''وغیرہ۔

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي﴾ [آل عمران:۳۹]

ترجمہ: تو فرشتوں نے اسے پکار کر کہا جبکہ وہ اپنی نماز کی جگہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

اعتراض: جب حضرت زکریا علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے تو اسی وقت فرشتوں نے ان کو کیوں پکارا جبکہ حالت نماز میں کسی کو آواز نہیں دی جاتی؟

مزید یہ کہ حالت نماز میں ہی حضرت زکریا نے جواب بھی دیا جبکہ نماز میں کسی کی بات کا جواب نہیں دیا جاتا ہے۔ حضرت زکریا نے حالت نماز میں یہ فرمایا:

﴿قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ﴾ [آل عمران:۴۰]

ترجمہ: عرض کی! اے میرے رب میرے یہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا! حالانکہ مجھے بڑھاپا آچکا ہے اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔

جواب: اس مقام پر نماز سے اصل نماز مراد نہیں ہے بلکہ دعا مراد ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام دعا فرما رہے تھے اس وقت فرشتوں نے ندا دی۔

۲۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد نماز ہی ہے البتہ ہوسکتا ہے کہ آپ کی امت میں درمیان نماز کلام کرنا جائز ہو جس طرح امت محمدیہ میں ابتدائے اسلام میں کلام کرنا جائز تھا۔

فائدہ: بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ نماز پڑھنے والے کو دوران نماز ندا کر سکتے ہیں اور کلام بھی کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے اس لیے کہ یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے فرشتوں نے ندا دی تھی لہذا اس پر عام لوگوں کے کلام کو قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی شریعت میں دوران نماز کلام کرنا جائز رہا ہو۔

﴿قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ﴾ [آل عمران:۴۰]

ترجمہ: عرض کی: اے میرے رب ! میرے یہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا ! حالانکہ مجھے بڑھاپا آچکا ہے اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔

اعتراض: حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا سے جب ان کو بیٹا عطا ہوا تب انھوں نے اللہ پاک کی عطا پر اس کی قدرت کا کیوں انکار کیا؟ حالانکہ ایک نبی کو اس طرح کا کلام کرنا کسی طرح درست نہیں ہے پھر آپ نے اپنے ہاں بیٹا ہونے کو اس قدر کیوں بعید سمجھا؟

جواب: انسان کو جب غیر متوقع طور پر کسی نعمت کے ملنے کی خوشخبری ملتی ہے تو تعجب کرتے ہوئے بار بار سوال کرتا ہے اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کو مایوسی کی عمر میں لڑکے کی ولادت کی خوشخبری ملی تو اللہ تعالیٰ کی اس قدرت عظیمہ پر تعجب کر رہے تھے نہ کہ اس کی قدرت کا انکار۔

۲۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ پاک کی قدرت پر شک نہیں تھا اور ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ وہ ایک نبی ہیں، بلکہ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کیا اللہ تعالیٰ ان کے بڑھاپے کو زائل کر کے اور ان کی بیوی کے بانجھ پن کو دور فرما کر بیٹا

عطا فرمائے گا یا اسی حالت میں ان کو بیٹا عطا فرمائے گا۔

۳۔تفسیر طبری میں ہے: جب حضرت زکریا علیہ السلام نے ندا سنی کہ فرشتے حضرت یحیی کی بشارت دے رہے ہیں اسی وقت آپ کے پاس شیطان آیا اور بولا: یہ جو تم نے ندا سنی ہے یہ من جانب اللہ نہیں ہے بلکہ یہ شیطان کی طرف سے ہے جو تم سے مذاق کر رہا ہے، اگر یہ ندا اللہ پاک کی طرف سے ہوتی تب اللہ پاک تم پر بذریعہ وحی ندا دیتا جس طرح دیگر معاملات میں تم پر وحی آتی ہے اس وقت آپ کو کچھ شک گزرا تب آپ نے فرمایا اور اللہ عزوجل سے اپنے اس امر پر ثبوت طلب کیا ہے اور عرض کی۔

﴿ قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّي آيَةً ﴾ [آل عمران: ۴۱]

ترجمہ: عرض کی: اے میرے رب میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔

﴿ إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ﴾ [آل عمران: ۴۵]

ترجمہ: اور یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک خاص کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسی بن مریم ہوگا۔

اعتراض: فرشتوں نے حضرت مریم کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ السلام آپ کا بیٹا ہے جبکہ حضرت مریم تو بہتر جانتی ہیں کہ ان کا بیٹا ہے اور عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ السلام ہے تب اس کو ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: بیٹوں کو ان کے باپ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور نسب باپ سے چلتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا کیے گئے تو

یہی بتانے کے لیے فرشتوں نے یہ کہا تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنا باپ کے پیدا ہوئے ہیں اور کوئی یہ نہ کہہ بیٹھے کہ یہ اللہ کے بیٹے ہیں اس لیے حضرت مریم کی طرف منسوب کیا۔

﴿وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [آل عمران:۴۶]

ترجمہ:اور لوگوں سے بات کرے گا پالنے میں اور پکی عمر میں۔

اعتراض: کہول کہتے ہیں ادھیڑ عمر والے کو،جس کی عمر تقریباً تیس سے پچاس سال کے درمیان کی ہو،حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گھوارے میں کلام کرنا تو خصوصیت ہے لیکن ادھیڑ عمر میں کلام کرنے میں آپ کا کونسا خاصہ ہے اس عمر میں تو ہر کوئی کلام کرتا ہے۔

جواب: ا۔اس آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں حالتوں میں انبیا کے کلام کرنے کی طرح کلام کریں گے،گھوارے میں کلام کرنے میں کوئی فرق نہیں ہوگا ویسے ہی کلام کریں گے جس طرح ادھیڑ عمر میں انبیا کا سا کلام کریں گے۔

۲۔ابو العباس نے فرمایا:حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گھوارے میں کلام کیا اور فرمایا:''انی عبد اللہ'' کہ میں اللہ کا بندہ ہوں،اور کہولت میں بھی یہ کلام کریں گے جب اللہ پاک آسمان سے اتارے گا اس وقت آپ کی عمر پینتیس سال کی ہوگی تب آپ فرمائیں گے''انی عبد اللہ''جس طرح آپ نے گھوارے میں فرمایا تھا۔زجاج نے کہا کہ یہ حضرت مریم کے لیے بشارت

بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ادھیڑ عمر تک باحیات رہیں گے۔

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ﴾[آل عمران:۵۵]

ترجمہ: یاد کرو جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھاؤں گا۔

اعتراض: آیت کریمہ میں تو یہ ہے کہ اللہ پاک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت دے گا پھر اٹھائے گا جبکہ آپ کو آسمان پر زندہ اٹھالیا گیا اور موت نہیں دی گئی۔

جواب:ا۔ یہاں تقدیم وتاخیر ہے اور اصلاً عبارت یوں ہے:

﴿إِنِّي رَافِعُكَ إِلَيَّ مُتَوَفِّيكَ﴾

۲۔ یہاں اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ اللہ پاک پہلے موت دے گا پھر اٹھائے گا اس لیے کہ ''واو'' مطلقاً جمع کے لیے آتا ہے اس میں ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا ہے مثلاً ''دخل زید و عمرو فی البیت'' تو ضروری نہیں کہ پہلے زید ہی داخل ہوا ہو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے عمرو داخل ہوا ہو یا دونوں ایک ساتھ داخل ہوئے ہوں۔

۳۔ یہاں وفات سے مراد نوم یعنی نیند ہے تو معنی ہوا ''انی منیمك و رافعك الیّ في نومك''یعنی میں تم پر نیند طاری کروں گا اور اسی نیند میں تم کو آسمان پر اٹھالوں گا۔

اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شہید ہونے پر استدلال

کرنا بالکل باطل ہے اس لیے قرآن پاک صراحت کے ساتھ فرمارہا ہے: ''**وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا**'' [النساء:۱۵۷]

ترجمہ: کہ بیشک انھوں نے اس (عیسیٰ) کو قتل نہیں کیا۔

﴿**إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ**﴾ [آل عمران:۵۹]

ترجمہ: بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے جسے اللہ نے مٹی سے بنایا۔

اعتراض: حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ و السلام سے پیدائش کے معاملہ میں تشبیہ دینا کس طرح درست ہے؟ جبکہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام مٹی سے بنے اور بنا ماں باپ کے اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوا کے ذریعہ اور صرف بنا باپ کے۔

جواب: تشبیہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ'' **من کل الوجوہ** '' تشبیہ پائی جائے بلکہ صرف ایک وصف میں تشبیہ پالی جائے تب بھی ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دینا درست ہوجاتا ہے۔

مذکورہ آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام کو بنا باپ کے پیدا ہونے میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام بنا باپ کے پیدا ہوئے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں۔

﴿**إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ**

تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾[آل عمران:۹۰]

ترجمہ: بے شک جولوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے پھر کفر میں اور بڑھ گئے توان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔

اعتراض: اس میں بتایا کہ جو مرتد ہو جائے اور پھر ارتداد میں اور بھی بڑھ جائے کفر کے ذریعہ، اس کی توبہ قبول نہ ہوگی حالانکہ ایسا نہیں ہے، مرتد کی توبہ مقبول ہے خواہ کتنے بھی کفر کرنے کے بعد توبہ کرے۔

جواب: ا۔یہاں مراد یہ ہے کہ جولوگ مرتد ہوئے اور کفر میں اور آگے بڑھ گئے پھر نزع کے وقت ایمان لائے اور توبہ کی توان کی توبہ قبول نہ ہوگی ان کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ﴾[النساء:۱۸]

ترجمہ: توبہ ان کی نہیں جو گناہوں میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے تو کہے اب میں نے توبہ کی۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت کریمہ سے مراد یہ ہے کہ جب تک وہ کفر پر قائم رہیں گے ان کی توبہ قبول نہ ہوگی بلکہ توبہ کے لیے ضروری ہے کہ کفر چھوڑ کر پورے عزم و ارادے کے ساتھ اسلام میں داخل ہو جائیں۔

۲۔اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مرتد ہوئے پھر اپنی زبان سے توبہ کا اظہار کر دیا لیکن دل کفر پر ہی قائم رہا۔تبھی ان کے بارے میں فرمایا کہ ان کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدىً لِلْعَالَمِينَ﴾ [آل عمران:٩٦]

ترجمہ: بے شک سب میں پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کو مقرر ہوا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہان کا راہنما۔

اعتراض: حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ تک بہت سے گھر اللہ کی عبادت کے لیے بنے لہذا خانہ کعبہ پہلا گھر کیسے ہوسکتا ہے؟ حالانکہ اس آیت میں بتایا گیا کہ خانہ کعبہ پہلا گھر ہے۔

جواب: ا۔اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ برکت وشرافت کے اعتبار سے خانۂ کعبہ پہلا گھر ہے۔

تفسیر طبری میں روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کی: خانہ کعبہ جس کے بارے میں خبر دی گئی کہ یہ پہلا گھر ہے، کیا یہ روئے زمین کا پہلا گھر ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ برکت کے اعتبار سے پہلا گھر ہے۔

۲۔تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ گھر تو اور بھی تھے پہلے سے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے یہ پہلا گھر تعمیر کیا گیا۔

﴿وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم﴾ [آل عمران:١١٠]

ترجمہ: اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔

اعتراض: دو چیزوں میں بھلائی ہو لیکن ان میں سے ایک میں زیادہ

بھلائی اور خیر ہو دوسرے میں اس کے بالمقابل کم ہو تب کہا جاتا ہے کہ یہ اس سے بہتر ہے۔

لیکن یہاں ایمان نہ لانے میں تو کوئی بھلائی ہی نہیں ہے پھر کیوں کہا گیا کہ ایمان لانے میں زیادہ بہتری ہے؟

جواب: آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ ان کا حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما لسلام پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا زیادہ بہتر ہے اس سے کہ صرف حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں۔

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ [آل عمران:۱۳۳]

ترجمہ: اور اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو۔

اعتراض: یہاں آیا ہے کہ دوڑو جبکہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔

آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْعُجْلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ وَالتَّأَنِّي مِنَ الرَّحْمٰنِ.

ترجمہ: جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے، اور تحمل و بردباری رحمن کی طرف سے ہے۔

جواب: جی ہاں! یہ بات ٹھیک ہے کہ جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔لیکن ہر معاملہ میں ایسا نہیں ہے، بلکہ بعض امور میں تو جلدی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک روایت میں آیا ہے۔

اَلْعُجْلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ إِلَّا فِي خَمْسَةٍ فَإِنَّهَا سُنَّةُ رَسُولِ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِطْعَامُ الضَّيْفِ، وَتَجْهِيْزُ الْمَيِّتِ، وتَزْوِيْجُ الْبِكْرِ، وَقَضَاءُ الدَّيْنِ، والتَّوْبَةُ مِنَ الذَّنْبِ.

ترجمہ: جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے سوائے پانچ کاموں کے (کہ ان میں جلد بازی کرنا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

(۱) مہمان کو کھانا کھلانے میں۔ (۲) میت کی تیاری میں۔ (۳) باکرہ کا نکاح کرنے میں۔ (۴) قرض کی ادائیگی میں۔ (۵) گناہ سے توبہ کرنے میں۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ [آل عمران: ۱۸۱]

ترجمہ: بے شک ہم نے ان کا قول سن لیا جنھوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم مالدار ہیں۔ اب ہم ان کی کہی ہوئی بات اور ان کا انبیا کو ناحق کے شہید کرنا لکھ رکھیں گے۔

اعتراض: یہود نے کہا کہ اللہ فقیر ہے۔ (العیاذ باللہ) تب اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم ان کی اس بات کو لکھ رکھیں گے مزید فرمایا ہے کہ ہم ان کا انبیا کو ناحق شہید کرنا لکھ رکھیں گے، اب محل اعتراض یہ ہے کہ ان کا قول تو سمجھ میں آتا ہے لیکن انھوں نے انبیا کو تو کبھی قتل کیا ہی نہیں تب کیوں فرمایا کہ انبیا کا قتل کرنا لکھ لیں گے۔

جواب: انہوں نے اگرچہ انبیا کرام کو شہید نہیں کیا لیکن وہ اس فعل پر راضی تھے، ان یہودیوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور

انبیا کے قتل پر راضی رہے، لھذا یہ بھی قتل کے مانند ہو گیا اسی لیے قرآن پاک نے ان الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

ایک شخص نے امام شعبی کے پاس آ کر ایک ایسے آدمی کی تعریف کی جس نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا تو امام شعبی نے فرمایا: تو ان کا خون کرنے میں برابر کا شریک ہے اس لیے کہ تو نے حضرت عثمان کے شہید ہونے پر رضامندی کا اظہار کیا۔

﴿أَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ [آل عمران:۱۸۲]

ترجمہ: بے شک اللہ بندوں پر بہت ظالم نہیں ہے۔

اعتراض: ظلّام مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے بہت بڑا ظالم، اس آیت کریمہ میں "لیس بظالم" ہونا چاہئے نہ کہ "بظلام" اس لیے کہ ظلام کی نفی سے از سر نو ظلم کی نفی نہیں ہوتی ہے بس کثرت ظلم کی نفی ہوتی ہے، حالانکہ اللہ پاک بندوں پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا ہے۔

جواب: اس آیت مبارکہ میں بندوں کی کثرت کی طرف نسبت کرتے ہوئے ظلام کا صیغہ لایا گیا ہے نہ کہ ظلم کی طرف نسبت کرتے ہوئے، اور اس طرح قرآن پاک میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً:

﴿ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ [الانعام:٦]

﴿ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴾ [الانعام:۵]

پہلی آیت میں غیب واحد کا صیغہ ہے تو عالم کا لفظ آیا، اور دوسری آیت میں غیوب جمع کا صیغہ ہے تو علام کا لفظ آیا ہے۔

﴿رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ﴾
[آل عمران:١٩٢]

ترجمہ: اے ہمارے رب! بے شک جسے تو دوزخ میں لے جائے اسے تو نے ضرور رسوائی دی۔

اعتراض: اللہ پاک نے سورۂ تحریم میں فرمایا: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ﴾ [التحریم:٨]

ترجمہ: جس دن اللہ رسوا نہ کرے گا نبی اور ان کے ساتھ کے ایمان والوں کو۔

پہلی آیت دلالت کر رہی ہے کہ اللہ پاک جس کو بھی جہنم میں داخل فرمائے گا اس کو رسوا فرمائے گا اور دوسری آیت دلالت کر رہی ہے کہ اللہ پاک مومنین کو رسوا نہ فرمائے گا اب نتیجہ نکلا کہ اللہ پاک مومنین کو جہنم میں داخل نہ فرمائے گا جبکہ یہ معتزلہ اور خوارج کا موقف ہے۔

جواب: مفسرین فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں داخل کیا اور ان کے کفر و شرک کے سبب ''خلود فی النار'' یعنی ہمیشہ کے لیے ان کو دوزخ میں ڈال دیا تو یقیناً ان کو رسوا کیا۔

اور مومنین کے لیے ''دخول في النار'' ہے ''خلود في النار'' نہیں ہے، لہذا مومنین اپنے گناہوں کی سزا کے لیے جہنم میں جائیں گے اس کے بعد اللہ پاک جہنم سے ان کو نکال کر جنت میں داخل فرما دے گا۔

﴿رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا﴾ [آل عمران:١٩٣]

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم نے ایک منادی کو سنا۔

اعتراض: یہاں ذکر ہے کہ منادی کو سنا جبکہ ندا (آواز، پکار) سنی جاتی ہے نہ کہ منادی۔

جواب: یہاں ندا ہی مراد ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے، ''ندا مناد'' یعنی اے رب ہم نے ندا دینے والے کی ندا سنی، جیسے کہا جاتا ہے۔

''سمعت زیدا یقول'' تو معنی یہ ہوتا ہے ''سمعت قول زید'' کہ میں نے زید کی بات سنی۔

﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ﴾ [آل عمران:۱۹۶]

ترجمہ: کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا ہرگز تجھے دھوکہ میں نہ ڈالے۔

اعتراض: یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے جبکہ آپ کی بابت یہ متصور نہیں کہ آپ کفار کے مال و دولت اور ان کے عیش و آرام سے دھوکہ کھا جائیں۔

تفسیر طبری میں حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ خدا کی قسم اللہ کے نبی نے کفار سے کبھی دھوکہ نہ کھایا حتی کہ آپ کا وصال ہو گیا۔

جواب: ۱۔اس آیت میں اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے لیکن مراد مومنین ہیں تو یوں معنی ہوا: ''لا یغرنکم أیھا المؤمنون''۔

قوم کا جو سربراہ اور رئیس ہوتا ہے اسی کو خطاب کیا جاتا ہے اور مراد اس کے ماتحت کے لوگ ہوتے ہیں یہی صورت حال یہاں بھی ہے۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ اس سے حضور پاک کو ہی خطاب ہے، اور تاکید اور ثابت قدمی کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورۃالنساء

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً﴾[النساء:۱]

ترجمہ: اے لوگوں! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی میں سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

اعتراض: مطلب یہ ہے کہ سب لوگ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پیدا ہیں اور حضرت حوا بھی حضرت آدم سے پیدا ہیں، لہذا حضرت حوا بھی حضرت آدم کی اولاد ہیں اور ہم بھی ان کی اولاد ہیں تب حضرت حوا ہماری بہن ہوئیں نا کہ ماں؟

جواب: ۱۔ یہاں من تبعیض کے لیے نہیں ہے بلکہ بیان جنس کے لیے ہے تو معنی یہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی جنس سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔

اس کی تائید اللہ پاک کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾[التوبہ:۱۲۸]

ترجمہ: بے شک تمہارے پاس رسول تشریف لائے تمہاری جنس میں سے۔

۲۔ اس آیت کریمہ میں من تبعیض کے لیے ہی ہے لیکن حضرت حوا حضرت آدم سے بطریق توالد معمولی پیدا نہیں ہوئیں اس لیے وہ اولاد نہیں ہو سکتی ہیں، آپ تو حضرت آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں اور نوع انسانی بطور توالد پیدا ہوئی ہے۔

وَ اٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ [النساء:۲]

ترجمہ: اور یتیموں کو ان کا مال دے دو۔

اعتراض: اس آیت میں بتایا گیا کہ یتیموں کو ان کا مال دے دو حالانکہ حکم شرع یہ ہے کہ جب تک یتیم بالغ نہ ہو جائیں ان کا مال ان کو نہ دو۔

جواب: یہاں مراد یہی ہے کہ یتیم جب بالغ ہو جائیں تو ان کو ان کا مال دے دو ، یہاں ان کے لیے یتیم کا لفظ ''ما کان'' کے اعتبار سے بولا گیا کہ جس حالت پر وہ پہلے تھے، اور قرآن پاک میں بہت سی مثالیں ہیں جن میں کہیں ''ما کان'' کے اعتبار سے اور کہیں ''ما یکون'' کے اعتبار سے تعبیر کیا گیا۔ مثلاً:

﴿اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ [الزمر:۳۰]

﴿اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا﴾ [الیوسف:۳۶]

ان دونوں آیتوں میں ''مایکون'' کے اعتبار سے ایک میں زندوں کو مردہ کہا اور دوسری میں کہا کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں حالانکہ شراب تو اس کی بعد حالت کا نام ہے۔

﴿مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِیبًا مَفْرُوضًا﴾ [النساء:۷]

ترجمہ: جو حصہ چھوڑ گئے ماں باپ، اور قرابت والے ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ حصہ ہے اندازہ باندھا ہوا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ''مما ترك الوالدان

والاقربون''میں قلیل وکثیر سب ترکہ شامل ہے پھر آیت میں الگ سے مِمَّا قَلَّ مِنۡهُ أَوۡ كَثُرَ ذکر کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اس مقام پر''مِمَّا قَلَّ مِنۡهُ أَوۡ كَثُرَ''کوتاکید کے لیے لایا گیا ہے اور یہ بتانے کے لیے کہ ترکہ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو اس کو وارثین کے مابین تقسیم کرنا لازم ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تھوڑا مال سمجھ کر تقسیم نہ کریں، اس کو ہلکا سمجھیں۔

تنبیہ: افسوس ہے کہ ایک طرف تو قرآن پاک اتنی تاکید فرمارہا ہے کہ ہر طرح کا ترکہ تقسیم کرو اور دوسری طرف لوگوں کی غفلت بلکہ تغافل اس حد تک ہے کہ تقسیم ترکہ میں کوئی توجہ ہی نہیں، بہنوں کو سرے سے ہی محروم کردیتے ہیں، اور بعض جو ترکہ تقسیم کرتے بھی ہیں لیکن احکام شرع کا لحاظ نہیں کرتے ہیں اور اپنی پسند چلاتے ہیں۔

﴿وَمَن يَعۡصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا﴾[النساء:۱۴]

ترجمہ: اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے آگے بڑھ جائے، اللہ اسے آگ میں داخل کرے گا جس میں ہمیشہ رہے گا۔

اعتراض: اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاصی اور مرتکب گناہ کبیرہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے جبکہ اس کے لیے بس دخول فی النار اس کے بعد اس کو نکال لیا جائے گا۔

جواب: مفسرین نے آیت کے معنی یہ بتائے ہیں کہ جو اللہ پاک کی نافرمانی کرے، اس کے احکام کا انکار کرے اور ان کو ٹھکرائے تو کافر ہو جائے گا، ظاہر سی بات ہے کہ اس طرح سے بندہ ایمان سے خارج ہو جائے گا اور ہمیشہ جہنم میں جلے گا۔

امام رازی تفسیر کبیر میں زیر آیت فرماتے ہیں:

فَعَلِمْنَاأَنَّ هٰذَاالْوَعِيْدَ مُخْتَصٌّ بِالْكَافِرِالَّذِي لَا يَرْضٰى بِمَا ذَكَرَهُ اللهُ فِي هٰذِهِ الْاٰيَةِ مِن قِسْمَةِ الْمَوَارِيْثِ .

ترجمہ: تو ہم نے جان لیا کہ یہ وعید کافر کے ساتھ خاص ہے جو اس آیت میں اللہ کے ذکر کردہ تقسیم ترکہ پر راضی نہ ہو۔

﴿حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ﴾[النساء:۱۵]

اعتراض: توفی اور موت دونوں ایک ہی معنی ہیں تب آیت کا معنی ہوا کہ یہاں تک کہ انھیں موت موت دے دے۔

جواب: ۱۔ یہاں موت سے پہلے لفظ ملائکہ محذوف ہے اور اصل عبارت یہ ہے" حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ مَلَائِكَةُ الْمَوْتِ "یعنی یہاں تک کہ انھیں موت کے فرشتے موت دیں۔

اس کی تائید وتفسیر قرآن پاک کی دیگر آیتوں سے ہوتی ہے مثلاً:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾[السجدة:۱۱]

﴿اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾[النحل:۲۸]

ان دونوں آیتوں میں موت دینے کی نسبت فرشتوں کی طرف کی گئی، لہذا

مانا جائے گا کہ اوپر والی آیت میں بھی مضاف محذوف ہے یعنی ملائکہ کا لفظ محذوف ہے۔

۲۔ یا یہاں ''توفی'' سے مراد پورا کرنا ہے تب آیت کا معنی یہ ہوگا: یہاں تک کہ موت ان (کی زندگی) کو پورا کر دے۔

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ﴾[النساء:۱۷]

اعتراض: یہاں کہا گیا کہ توبہ اللہ تعالیٰ پر ہے حالانکہ معاملہ تو اس کے برعکس ہے وہ یہ کہ توبہ تو بندہ پر ہے اور اللہ پاک تو بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

جواب: ۱۔اس کا مطلب ہے کہ بے شک توبہ قبول کرنا اللہ پاک کے فضل وکرم پر ہے۔

۲۔ یا مراد یہ ہے کہ اللہ پاک کا رحمت وبخشش کے ذریعہ اپنے بندے کی جانب رجوع کرنا ہے اس لیے کہ لغت میں توبہ رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ﴾ [النساء:۱۷]

ترجمہ: وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے فضل سے لازم کرلیا، وہ انھیں کی ہے جو جہالت سے برائی کر بیٹھے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں رب تبارک وتعالیٰ نے توبہ کی قبولیت کے لیے یہ شرط لگادی کہ جو جہالت ونادانی سے گناہ کرے گا اس کی توبہ قبول ہوگی۔

لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ جہالت ونادانی سے جو گناہ ہوتا ہے اس پر تو بندہ مواخذہ اور گرفت کا مستحق ہی نہیں ہے تو اس پر توبہ کرنے یا قبول ہونے کا

کیا مطلب ہے، دوسری بات یہ کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ اللہ پاک جان بوجھ کر گناہ کرنے والے کی توبہ بھی قبول فرماتا ہےاوراس آیت کریمہ سے معلوم ہوتاہے کہ صرف نادانی میں گناہ کرنے والوں کی ہی توبہ قبول فرماتا ہے۔

جواب: ۱۔ رب تعالیٰ کے نزدیک معصیت کاارتکاب جہالت ہےاگر چہ عمداً کیاجائے۔

تفسیر طبری میں ہے ابو عالیہ فرماتے ہیں: ''ان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كانوا يقولون: كُلَّ ذَنْبٍ أَصَابَهُ عَبْدٌ فَهُوَ بِجِهَالَةٍ.

ترجمہ: صحابۂ کرام فرماتے تھے کہ بندہ جو بھی گناہ کرتا ہےتو وہ اپنی ہی جہالت ونادانی سے کرتا ہے۔

ارشاد باری ہے: قَالَ هَلْ عَلِمْتُم مَّا فَعَلْتُم بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ [يوسف: ۸۹]

ترجمہ: یوسف نے (اپنے بھائیوں سے) کہا: کیا تم کوعلم ہے کہ تم نے یوسف اوراس کے بھائی کےساتھ کیا سلوک کیا جب تم جاہل تھے۔

اس آیت کریمہ میں عمداً معصیت پر جہالت کا اطلاق کیا گیاہے۔

۲۔ یہاں جہالت سے مراداس فعل کیے گناہ ہونے کی جہالت نہیں ہے بلکہ اس فعل پر جوعذاب مرتب ہوتاہےاس کی جہالت مراد ہے۔

۳۔ کبھی انسان کوفعل کے گناہ کا علم ہوتا ہے لیکن اس پر ہونے والے عذاب کی کیفیت ومدت سے جاہل ہوتا ہے لہذا آیت کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔

﴿وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیۡ﴾
[النساء:۲۳]

ترجمہ:(اور عورتوں کی) بیٹیاں جوتمہاری گود میں ہیں۔

اعتراض: یہاں ربیبہ کی حرمت کے لیے قید لگا دی کہ شوہر کی گود اور اس کی پرورش میں ہو حالانکہ حرمت تو مطلقاً ثابت ہے خواہ وہ ربیبہ شوہر کی پرورش میں ہو یا نہ ہو۔

جواب: جی ہاں! ربیبہ کی حرمت مطلقاً ہے البتہ آیت کریمہ میں جو قید ہے وہ قید اتفاقی ہے احترازی نہیں، یا اس وجہ سے یہ قید لگا دی کہ غالباً ایسا ہوتا ہے تو غالب حال کے اعتبار سے اس کو ذکر کر دیا ہے شرط کے طور پر نہیں۔

﴿فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَ اٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ﴾
[النساء:۲۵]

ترجمہ: (کنیزوں) کے مالکوں کی اجازت سے ان (کنیزوں) سے نکاح کرلو اور اچھے طریقے سے انہیں ان کا مہر دے دو۔

اعتراض: مہر کا مالک تو آقا ہے نہ کہ اس کی باندی، لہذا مہر اس کے آقا کو ہی دینا لازم ہے، لیکن مذکورہ آیت میں حکم دیا گیا کہ مہر باندی کو دے دو۔

جواب: یہاں کہا گیا کہ مہر باندی کو دے دو چونکہ مہر باندی کو دو، یا آقا کو مالک آقا ہی ہوگا اس لیے کہ باندی کے ہاتھ میں جو کچھ ہے ان سب کا مالک اس کا آقا ہی ہے۔

اس کی تائید ارشاد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ﴾
[النحل:٦١]

ترجمہ: اللہ نے ایک کہاوت بیان فرمائی ایک بندہ ہے دوسرے کی ملک خود کچھ مقدور نہیں رکھتا۔

اس آیت سے واضح ہوا کہ غلام اور باندی خود مالک نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کے آقا ان کے مال و دولت وغیرہ کے مالک ہوتے ہیں۔

﴿يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ [النساء:٢٦]

ترجمہ: اللہ چاہتا ہے کہ اپنے احکام تمہارے لیے بیان کردے۔

اعتراض: "أراد" أن کے ساتھ مقترن ہوتا ہے جبکہ اس آیت کریمہ میں لام کے ساتھ ہے۔ مثلاً: أردت أن اذهب إلى السوق .

قرآن پاک میں ہے:

﴿يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ﴾ [النساء:٢٨]

ترجمہ: اللہ چاہتا ہے کہ تم پر تخفیف کرے۔

جواب: یہ کوئی قابل التفات اعتراض نہیں ہے اس لیے کہ "لام" کا أن کے معنی میں استعمال ہونا عام بات ہے، خود قرآن کریم میں متعدد مقامات پر "لام" أن کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مثلاً: ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ﴾ [الصف:٨]

ترجمہ: چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے موضوں سے بجھا دیں۔

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾[النساء:۲۹]

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت تمہارے مابین رضامندی سے ہو۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں سے صرف بذریعہ تجارت ہی مال حاصل کیا جا سکتا ہے حالانکہ اس کے علاوہ ہبہ، صدقہ، ضیافت اور وصیت وغیرہ بھی اس کے حصول کے طریقے ہیں، پھر تجارت ہی کو خاص کیوں کیا؟

جواب: یہاں تجارت کو بطور خاص اس لیے ذکر کیا کہ یہ حصول مال کا سب سے اقوی اور اغلب طریقہ ہے۔ نیز یہ کہ مال و دولت کے اکثر تصرفات تجارت کے ذریعہ سے ہی ہوا کرتے ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے:

اَطْيَبُ الْكَسَبِ كَسَبُ التِّجَارِ اِذَا حَدَّثُوْا لَمْ يَكْذِبُوا وَاِذَا وَعَدُوْا لَمْ يُخْلِفُوْا وَاِذَا أئْتُمِنُوْا لَمْ يَخُوْنُوْا(اخرجه الاصبهانی)

ترجمہ: سب سے پاکیزہ کمائی تاجروں کی کمائی ہے، جب بولیں تو جھوٹ نہ بولیں، اور جب وعدہ کریں تو اس کے خلاف نہ کریں، اور جب انہیں امین بنایا جائے تو خیانت نہ کریں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾[النساء:۴۸]

ترجمہ: بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے جسے چاہتا ہے معاف فرما دیتا ہے۔

اعتراض: یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ شرک کے علاوہ جو گناہ ہیں ان کو اللہ پاک چاہے تو بخش دے۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾[النساء:١٦٨]

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا، اللہ ہرگز انہیں نہ بخشے گا اور نہ انھیں کسی راستے کی ہدایت فرمائے گا مگر جہنم کے راستے کی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ کفر اور ظلم بھی اللہ پاک معاف نہیں فرمائے گا جبکہ یہ دونوں شرک کے علاوہ ہیں، لہذا اب دونوں آیتوں میں تعارض ہے تو ان میں تطبیق کیسے ممکن ہو گی؟

جواب: ا۔ دوسری آیت میں ظلم سے مراد شرک ہی ہے، دوسرے مقام پر ارشاد باری ہے۔''اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ'' کہ شرک بڑا ظلم ہے۔[لقمان:١٣]

رہا یہ کہنا کہ کفر بھی تو شرک کا غیر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ''وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ'' یہ رب تبارک وتعالیٰ کی مشیئت پر ہے اور دیگر آیات قرآنیہ میں بتا دیا کہ اس کی مشیئت میں کفار داخل نہیں ہیں لہذا اب

متعین ہو گیا کہ کفار بھی انھیں میں شامل ہیں جن کو اللہ پاک نہیں بخشے گا۔

۲۔ پہلی آیت کریمہ میں عموم ہے لیکن بعد کی آیت میں کفر کو ذکر کر کے اس کو خاص کر دیا کہ کفر اس عموم میں داخل نہیں ہے اور اس کی تائید پر تو پوری امت کا اجماع ہے کہ جس طرح اللہ پاک شرک کو معاف نہ فرمائے گا اسی طرح کفر کو بھی معاف نہ فرمائے گا۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ﴾[النساء: ۴۹]

ترجمہ: کیا تم نے انہیں نہ دیکھا جو خود اپنی ستھرائی بیان کرتے ہیں بلکہ اللہ جسے چاہے ستھرا کرے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں اللہ پاک نے یہود و نصاریٰ کی مذمت فرمائی ہے اس بات پر کہ وہ اپنا تزکیہ کرتے اور خود کو ستھرا سمجھتے تھے۔

اسی طرح ایک اور آیت کریمہ میں ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو خود کو ستھرا بتاتے تھے: ﴿فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ﴾[النجم: ۳۲]

ترجمہ: تو آپ اپنی جانوں کو ستھرا نہ بتاؤ وہ خوب جانتا ہے جو پرہیزگار ہیں۔

وہیں دوسری طرف انبیائے کرام خود کی تعریف کیا کرتے تھے اور حمد و ستائش ان کی ہی زبانی ان کے بارے میں ثابت ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

واللہ انی لأمین فی السماء أمین فی الارض.

یعنی خدا کی قسم میں زمین وآسمان میں سب سے زیادہ امین ہوں۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾

[یوسف:۵۵]

ترجمہ: یوسف نے کہا مجھے زمین کے خزانوں پر کر دے، بے شک میں حفاظت والا، علم والا ہوں۔

جواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس وقت ارشاد فرمایا تھا کہ جب آپ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تب ایک خارجی نے اعتراض کرتے ہوئے کہا ''اِعْدِلْ یَا مُحَمَّد'' اے محمد انصاف کرو، تب حضور نے یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ خدا کی قسم اگر میں (محمد) انصاف نہیں کروں گا تو کون انصاف کرے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ خدا کی قسم زمین وآسمان میں سب سے بڑھ کر امین ہوں۔

رہا حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا تو آپ نے اس لیے فرمایا تھا تاکہ اس کے ذریعہ اس عہدہ تک رسائی ہو جائے جو انبیائے کرام کا فرض منصبی ہے مثلاً: عدل و انصاف قائم کرنا، احکام الٰہیہ نافذ کرنا، حق و صداقت کو عام کرنا، حضرت یوسف علیہ السلام بخوبی جانتے تھے کہ اس وقت ان کے علاوہ کوئی ان امور کو بخوبی انجام نہیں دے سکتا ہے اس لیے اپنے فرض منصبی کے طلب کے لیے یہ فرمایا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی شریعت میں جائز ہو اسی لیے آپ

نے یہ طلب فرمایا ہو۔

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ﴾[النساء:٥٦]

ترجمہ: جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کے سوا اور کھالیں انہیں بدل دیں گے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا جب جہنمیوں کی کھالیں آگ میں بالکل پک کر جل جائیں گی تب اللہ پاک دوسری کھالیں ان کے جسموں پر چڑھا دے گا۔

اب محل اعتراض یہ ہے کہ جب دوسری جلدوں (کھالوں) نے گناہ کیے نہیں تو ان پر کیوں عذاب کیا جائے گا؟ یہ تو ایک طرح کا ظلم ہے۔

جواب: ا۔انسان کی روح پر عذاب ہوگا، اس کے گوشت اور کھال کو اس لیے جلایا جائے گا تا کہ عذاب کی تکلیف نفس انسان کو پہنچ جائے لہذا جلد و گوشت پر عذاب نہ ہوگا، جب یہ معاملہ ہے تو خواہ انسان کی دنیوی کھال پر عذاب دیا جائے یا پھر دوسری کھال بدل بدل کر اس پر عذاب دیا جائے کوئی حرج نہیں کہ عذاب تو نفس انسان پر ہی ہوگا۔

۲۔دوسرا قول یہ ہے کہ انسان کے گوشت جلد اور سارے اجزا پر عذاب ہوگا اور سارے اجزا کو تکلیف پہنچے گی، اور آیت کریمہ: ''كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا'' کا معنی یہ ہے کہ ان کی وہی کھالیں جو جلتی جائیں گی پھر سے وہ نئی ہوتی جائیں گی، یہاں غیر اس

لیے فرمایا کہ صنعت میں تغیر ہے نفس جلد میں نہیں۔

تنبیہ۔: عبد اللہ بن مبارک حضرت حسن بصری سے بطور بلاغ روایت کرتے ہیں کہ جہنمیوں کی کھالیں ایک دن میں ستر ہزار مرتبہ جلیں گی۔

ربیع سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے پہلے کی کتابوں کے حوالے سے سنا کہ اہل جہنم کی کھال کی موٹائی چالیس ہاتھ ہوگی، اور داڑھ ستر ہاتھ اور پیٹ کا حال تو یہ ہوگا کہ اگر اس میں پورا پہاڑ رکھ دیا جائے تب بھی نہ بھر پائے گا، اور جب جب آگ ان کی کھالیں جلائے گی دوسری کھال نکلتی جائے گی۔

﴿وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا﴾ [النساء:۵۷]

ترجمہ: ہم انھیں وہاں داخل کریں گے جہاں سایہ ہی سایہ ہوگا۔

اعتراض: یہاں کہا گیا کہ ہم اہل جنت کو ایسی جگہ داخل کریں گے جہاں سایہ ہی سایہ ہوں گے، لیکن جنت میں سورج ہی نہیں ہوگا کہ اس کی دھوپ سے بچنے کے لیے سایہ کی ضرورت درپیش آئے۔

جواب: بلاد عرب میں شدت کی گرمی پڑتی تھی دھوپ بھی نہایت تیز رہتی تھی اس لیے ان کے لیے سایہ ایک عظیم نعمت تھا اور راحت وسکون کا اہم ذریعہ تھا تو قرآن پاک نے اسی سے کنایہ کرتے ہوئے انھیں کے اعتبار سے کلام فرمایا۔

قرآن پاک میں آیا ہے: ’’وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا‘‘ [مریم: ۶۲]

کہ اہل جنت کو صبح وشام رزق ملے گا، یہاں صبح وشام کہا گیا جبکہ جنت میں کوئی

طلوع شمس وغروب شمس نہیں ہے کہ وہاں صبح وشام ہوگی۔ بس یہ دنیوی اعتبار سے کلام کیا گیا ہے۔

﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ [النساء:٧٦]

ترجمہ: بے شک شیطان کا داؤ کمزور ہے۔

اعتراض: یہاں شیطان کے داؤ کوضعیف کہا، اور دوسرے مقام پر عورتوں کے بارے میں فرمایا: ''اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ'' [الیوسف:٢٨] کہ تمہارا (عورتوں کا) داؤ بڑا ہے حالانکہ معاملہ اس کے عکس ہے وہ یہ کہ شیطان کا داؤ عورتوں کے داؤ اور مکروفریب سے بہت بڑھ کر ہے۔

جواب: یہاں فرق اعتباری ہے، اس طور پر کہ اللہ رب العزت کی حمایت ونصرت اور مدد کے بالمقابل شیطان کا داؤ اور اس کا مکروفریب کمزور ہے بلکہ کالعدم ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ'' [الحجر:٤٢] کہ بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کچھ قابو نہیں ہے۔

اور دوسری آیت کریمہ میں مراد یہ ہے کہ مردوں کے بالمقابل عورتوں کا مکروفریب اوران کا داؤ بہت بڑا ہے۔

٢۔ ایک قول یہ ہے کہ ''اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ'' یہ قول عزیز مصر کا ہے نہ کہ اللہ رب العزت کا لہذا اب کوئی اعتراض نہ رہا۔

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا﴾
[النساء:٩٣]

ترجمہ: اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے کہ ہمیشہ وہ اس میں رہے گا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے تو بالکل واضح ہوتا ہے کہ مومن بھی ارتکاب کبیرہ کے سبب ہمیشہ جہنم میں رہیں گے؟

جواب: ا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ کسی نے مسلمان کو اس کے مسلمان ہونے کے سبب یا حلال سمجھ کر قتل کیا تو وہ کافر ہو گیا، اور کافر کی سزا یہی ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

تفسیر طبری میں ہے: فمعنی الآیۃ: ''ومن یقتل مؤمنا متعمدا مستحلا قتلہ فجزاؤہ جھنم خالداً فیھا''۔

ترجمہ: آیت کا معنی یہ ہے کہ جو کسی مومن کو جان بوجھ کر حلال جان کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے اور اس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

۲۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں خلود سے مراد طولِ مدت اور عرصۂ دراز ہے کہ وہ جہنم میں عرصۂ دراز تک رہے گا چونکہ لفظ خلود کبھی طویل مدت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: ''خلد السلطان فلانا فی الحبس'' کہ بادشاہ نے فلاں کو ہمیشہ قید میں رکھا۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب لمبی مدت تک قید میں رکھا ہو۔

﴿فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ [النساء: ۹۵-۹۶]

ترجمہ: اللہ نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کا درجہ بیٹھنے والوں سے بڑا کیا، اور اللہ نے سب سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے، اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے ثواب سے فضیلت دی ہے اور اس کی طرف سے درجے ہیں۔

اعتراض: اس آیت کریمہ کے پہلے جز میں کہا گیا کہ اللہ پاک مجاہدین کو جہاد سے بیٹھے رہنے والوں (یعنی وہ لوگ جو جہاد میں شریک نہیں ہوئے) پر ایک درجہ فضیلت دیتا ہے، اور دوسری آیت میں فرمایا درجات یعنی مجاہدین کو ان پر کئی درجہ فضیلت دیتا ہے لہذا ایک ہی آیت میں تعارض ہے، اس کو کیسے دفع کیا جائے؟

جواب: پہلے جز میں جو مجاہدین کو ان پر فضیلت دی جو بیٹھے رہے اور جہاد میں شریک نہ ہوئے، اس میں بیٹھے رہنے سے وہ لوگ مراد ہیں جو دل وجان سے جہاد میں شرکت کے خواہاں تھے لیکن کسی عذر کے سبب شرکت نہ کر سکے، ان کی حدیث شریف میں فضیلت بھی آئی ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مال غنیمت سے حصہ بھی دیا کرتے تھے۔

اور آیت کے دوسرے جز میں جہاں درجات کا اور ثواب عظیم کا ذکر ہے ''وہاں بیٹھے رہنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو بلا عذر بیٹھے رہے اور جہاد میں شریک نہ ہوئے تو ایسے لوگوں کے لیے کوئی فضیلت نہیں نہ ہی عنداللہ کوئی درجہ ہے''۔

﴿وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ [النساء:۱۰۰]

ترجمہ: اور جو اپنے گھر سے اللہ و رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلا پھر اسے موت نے آلیا تو اس کا ثواب اللہ پر ہو گیا۔

اعتراض: اللہ رب العزت پر اس کا اجر لازم نہیں ہوا اس لیے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا اجیر نہیں کہ اس پر اجر لازم ہو بلکہ وہ صرف بندہ اور خالص غلام ہے پھر اس آیت کریمہ میں کیوں کہا گیا کہ اللہ پر اجر لازم ہو گیا۔

جواب: یہاں معنی یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اس کا اجر اپنے ذمہ کرم پر لے لیا ہے اور اس نے مومنین سے وعدہ فرمایا ہے کہ جو بھی نیک عمل کرے گا تو اللہ رب العزت اس کے اجر کو ضائع نہیں فرمائے گا۔ ارشاد باری ہے: ﴿ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴾[الکھف: ۳۰]

ترجمہ: کہ ہم ان کے اجر کو ضائع نہیں کرتے جن کے کام اچھے ہوں۔

لہذا جب اللہ پاک نے وعدہ فرما دیا تو اس کے خلاف ہونا محال ہے لہذا یہاں لزوم اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے بندوں سے وعدہ فرمایا ہے۔

﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ﴾[النساء: ۱۰۱]

ترجمہ: اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر گناہ نہیں کہ بعض نمازیں قصر سے پڑھو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں ایذا دیں گے۔

اعتراض: اس آیت میں نماز قصر کرنے کو اس شرط سے مقید کیا کہ کفار

یا دشمنوں کا خوف ہوتو اس کا مطلب ہوا کہ اگر دشمن کا خوف ہوتو سفر میں قصر کرے اور اگر خوف نہ ہوتو پوری نمازیں پڑھے؟

جواب: ا۔ غالباً ایسا ہوتا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام سفر پر جاتے تھے تو راستہ پُر امن نہیں ہوتا تھا اسی لیے یہاں غالب کا اعتبار کرتے ہوئے اس قید کو ذکر دیا ہے لہذا یہ قید اتفاقی ہے احترازی نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں ہے، یعلی بن امیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ اللہ رب العزت نے تو یہ فرمایا:

﴿أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا﴾[النساء:101]

اور اب تو ہم لوگ امن میں ہیں (یعنی امن کی حالت میں قصر نہیں ہونی چاہیے) آپ نے فرمایا: اس کا مجھے بھی تعجب ہوا تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: یہ ایک صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر تصرف فرمایا لہذا اس کا صدقہ قبول کرو۔[صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ المسافر وقصرھا، رقم الحدیث:٦٨٦]

٢۔ اس آیت میں "أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ" پر کلام ختم ہوگیا ہے، اور "ان خفتم" سے ایک الگ کلام ہے۔ "ان خفتم" شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے "فاحتاطوا" تو معنی یہ ہوا کہ اگر تم کو کفار کے فتنہ کا خوف ہو تو احتیاط کرو۔

۳۔ یہاں قصر سے مراد ہے نماز کے ارکان و شرائط میں قصر کرنا ہے کہ جب دشمنوں کا زیادہ خوف ہو تو رکوع، سجود اور استقبال قبلہ وغیرہ ترک کرنا جیسا کہ نماز خوف کے باب میں مکمل تفصیل موجود ہے۔

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾[النساء:۱۰۳]

ترجمہ: بے شک نماز مسلمانوں پر وقت باندھا ہوا فرض ہے۔

اعتراض: ا۔ لفظ کان تو صرف ایک زمانہ کو بتاتا ہے اور وہ ہے ماضی، جبکہ نماز تو زمانہ حال و مستقبل اور قیامت تک فرض ہے، اس لحاظ سے آیت کا معنی ہوا: نماز مسلمانوں پر وقت معینہ پر فرض تھی۔

جواب: لفظ کان کئی معنوں میں مستعمل ہے مثلاً: ''وَكَانَ اللهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا''[النساء:۱۷]

اس آیت میں کان دوام وازل کے لیے مستعمل ہے۔

مذکورہ آیت میں کان حال کے معنی میں ہے لہذا آیت کا معنی یہ ہوا کہ نماز مسلمانوں پر متعینہ وقتوں پر فرض ہے۔

﴿إِنْ يَّدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا﴾[النساء:۱۱۷]

ترجمہ: یہ شرک کرنے والے اللہ کے سوا عبادت نہیں کرتے مگر چند عورتوں کی، اور یہ عبادت نہیں کرتے مگر سرکش شیطان کی۔

اعتراض: عورتوں سے مراد ان کے بت جن کا نام لات، عزی، منات وغیرہ تھا۔

پہلی آیت میں کہا کہ یہ عورتوں کی عبادت کرتے ہیں اور اسی آیت کے دوسرے جز میں کہا کہ یہ سرکش شیطان کی عبادت کرتے ہیں تو ان دونوں میں تطبیق کیسے ممکن ہے جبکہ دونوں جز میں حصر کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

جواب: ا۔ کفار ومشرکین عبادت بتوں کی کرتے تھے لیکن شیطان کی اطاعت میں کرتے تھے کہ ان کی عبادت کا حکم شیطان ہی دیا کرتا تھا، وہی ان کے سامنے بتوں کی عبادت کو مزین کر کے پیش کرتا اور ان کو اس طرف لبھاتا تھا اس لیے شیطان کی طرف نسبت کر دی گویا کہ کفار ومشرکین شیطان کی ہی عبادت کرتے تھے۔

۲۔یا یہ کہ دوسرے جز یعنی ''وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا''میں عبادت سے مراد اطاعت ہے لہذا اب کوئی تعارض نہ رہا۔

ابن ابی حاتم نے سفیان سے روایت کیا ہے کہ وہ جن بتوں کی عبادت کرتے تھے، ان میں سے ہر بت میں ایک شیطان تھا۔

﴿وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا﴾[النساء:۱۲۴]

ترجمہ: اور جو کچھ بھلے کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ ہو مسلمان، تو وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے اور ان پر تل کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ظلم کی نفی میں صالح مومنین کو ہی کیوں خاص کیا گیا ہے جبکہ اللہ رب العزت تو غیر صالح بلکہ کفار ومشرکین وغیرہ پر بھی

ظلم نہیں فرماتا ہے اور نہ ہی بروز قیامت ان پر کچھ بھی ظلم فرمائے گا۔

جواب: ا۔اس سے پہلے کی آیت میں مسلمان اور اہل کتاب کا بیان ہوا ہے اس لیے ''وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا '' ان دونوں فریق کی جانب راجع ہے اور معنی یہ ہے کہ روز قیامت مسلمان اور اہل کتاب کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

۲۔یا بروز قیامت مومنین کے اعمال کے ثواب کی نفی کرنا مراد ہے کہ قیامت میں مومنین کو جو نیک اعمال کے عوض ثواب ملے گا اس میں سے ذرہ برابر بھی کم نہ کیا جائے گا اب یہ حکم مومنین کے لیے خاص ہوگا چونکہ کفار و مشرین کو تو ان کے اعمال پر ثواب ہی نہ ملے گا چہ جائے کہ اس میں کمی بیشی ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا﴾[الفرقان:۲۳]

ترجمہ: اور جو کچھ انہوں (کفار) نے کام کیے تھے، ہم نے قصد فرما کر انہیں باریک باریک غبار کے بکھرے ہوئے ذرے کر دیا کہ روشندان کی دھوپ میں نظر آتے ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ﴾[النساء:۱۳۶]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

اعتراض: یہاں ایمان والوں سے کہا جارہا ہے کہ ایمان لاؤ یہ تو تحصیل حاصل ہے، جب وہ پہلے سے ہی مومن ہیں تو پھر ایمان لانے کا کیا معنی ہے؟

جواب: ۱ جولوگ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیا ورسل پر ایمان لائے اور ان کی کتابوں کی تصدیق کی ان سے اس آیت میں خطاب ہے کہ اب اللہ کے رسول جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاؤ۔

۲۔ یا یہاں ثابت قدمی مراد ہے کہ اے ایمان والو! اپنے ایمان پر ثابت قدم رہو۔

تفسیر قرطبی میں زیر آیت ہے: نزلت فی جمیع المؤمنین والمعنی یا ایھا الذین صدقوا اقیموا علیٰ تصدیقکم و اثبتوا علیه.

ترجمہ: یہ آیت تمام مومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس کا معنی یہ ہے: اے لوگو! جنہوں نے اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کی تصدیق کی ہے تو اپنی تصدیق پر قائم اور ثابت قدم رہو۔

﴿وَلَن يَجۡعَلَ ٱللَّهُ لِلۡكَٰفِرِينَ عَلَى ٱلۡمُؤۡمِنِينَ سَبِيلًا ﴾

[النساء: ۱۴۱]

ترجمہ: اور اللہ کافروں کو مسلمانوں پر کوئی راہ نہ دے گا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ پاک کفار کو مومنین پر کوئی غلبہ نہ دے گا جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کفار بھی ہم پر غالب آجاتے ہیں۔ جیسے غزوۂ احد میں اور اس کے علاوہ کبھی کبھی وہ ہم پر غالب آجاتے ہیں اور کبھی ہم ان پر غالب آجاتے ہیں۔

جواب: ۱۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ شرعی طور پر کفار مومنین پر کبھی راہ نہ پائیں گے لہذا جب بھی وہ راہ پائیں گے تو خلاف شرع ہی ہوگا۔

یا یہ معنی ہے کہ وہ حجت شرعیہ یا حجت عقلیہ کے ذریعہ راہ نہ پائیں گے

جب جب وہ اپنی حجت پیش کریں گے مومنین اس کو باطل کر دیں گے بالآخر ''فبھت الذی کفر'' ہی نتیجہ نکلے گا۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اللہ پاک کفار کو مومنین پر غلبہ نہ دے گا مگر ہاں! اگر مومنین باطل کاموں میں آگے بڑھتے رہے اور برے کاموں سے باز نہ آئے، اور توبہ سے دور بھاگتے رہے تب اللہ پاک انھیں ان کے کرتوتوں کے سبب دشمنوں کو ان پر مسلط فرما دے گا۔

اس کی تائید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے: ''وَمَآ أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ'' [الشوری:۳۰]

ترجمہ: اور تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اس کے سبب ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا۔

امام ابن العربی نے فرمایا: یہ عمدہ توجیہ ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث پاک ہے: جو اس معنی کی وضاحت کرتی ہے:

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو سمیٹ دیا، تو میں نے اس کے مشرق و مغرب کو دیکھا، اور میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک میرے لیے زمین سمیٹ دی گئی تھی، مجھے دو خزانے دیے گئے ایک سرخ (سونا) اور دوسرا سفید (چاندی) میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لیے یہ سوال کیا کہ انہیں عام قحط سے ہلاک نہ کرے، اور ان پر اپنے دشمن کو مسلط نہ کرے جو ان کے بنیادی مرکز کو تباہ کر دے۔ تو میرے رب نے فرمایا:

اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب میں کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو وہ رد نہیں کیا جاتا اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لیے یہ منظور کیا ہے کہ انہیں عام قحط سے ہلاک نہ کروں گا، اور نہ ہی ان پر ایسے دشمن کو مسلط کروں گا جو ان کے بنیادی مرکز کو تباہ کر دے اگر چہ تمام اطراف سے دشمن ان کے خلاف اکٹھے ہو جائیں، جب تک مسلمان خود ایک دوسرے کو ہلاک نہ کریں اور ایک دوسرے کو قید نہ کریں۔ [صحیح مسلم، کتاب الفتن والشراط الساعة، رقم الحدیث: ۲۸۸۹]

﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء:۱۴۵]

ترجمہ: بے شک منافق دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہیں۔

اعتراض: منافقین پر کفار سے زیادہ سخت عذاب ہوگا حالانکہ وہ تو کفار کے بالمقابل اچھی حالت میں ہیں اس لیے کہ ان پر حکم کفر نہیں لگا سکتے اور نہ ہی ان کو قتل کر سکتے ہیں پھر منافقین کو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں داخل کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اور منافقین کے بارے میں ہے کہ وہ ایمان وکفر کے درمیان مذبذب ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ﴾

[النساء:۱۴۳]

ترجمہ: (منافقین) بیچ میں ڈگمگا رہے ہیں نہ ادھر کے ہیں ادھر کے ہیں۔

جواب: بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منافقین کفار سے اچھی حالت میں ہیں لیکن روز قیامت اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک یہ سب سے بدتر اور خستہ

حالت میں ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کفر کیا اور اوپر سے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کا مذاق اڑایا، اور اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ اور مومنین کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ جو کھلا دشمن ہو اس سے بچنا مشکل نہیں ہوتا ہے، سب کو معلوم ہے کہ یہ میرا کھلا دشمن ہے لیکن اگر کوئی خفیہ دشمن ہو تو اس سے زیادہ خطرہ ہے تمہارے دین کو بھی اور تمہاری جان و مال کو بھی اس لیے منافقین سے اسلام کو زیادہ اندیشہ تھا۔

فائدہ: بعض لوگ یہ مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل سنت و جماعت وہابی، دیوبندی، قادیانی وغیرہ سے اپنی نفرت کیوں کرتے ہیں، کفار ومشرکین سے بھی زیادہ ان سے نفرت کرتے ہیں جبکہ یہ لوگ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز اور روزے کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔

تو اس کا جواب یہی ہے کہ کفار و مشرکین اور دوسرے دھرم والے تو ہمارے کھلے دشمن ہیں، اور عوام بھی جانتی ہے کہ یہ ہمارے دین دھرم کے نہیں ہیں لہذا ان سے دور رہنا چاہیے اس اعتبار سے ان کے شر سے بچنا آسان ہے۔

لیکن وہابی، دیوبندی اور قادیانی وغیرہ یہ خفیہ طور پر دین کے رہزن ہیں، یہ اپنے لباس اور نماز و روزے کے ذریعہ بھولی عوام کے دلوں کو لبھاتے ہیں پھر ان کے عقیدے خراب کر دیتے ہیں اور بھولی بھالی عوام کو احساس تک نہیں ہوتا ہے۔

جس کے بارے میں مشہور ہو کہ یہ چور ہے اس سے سب لوگ ہوشیار اور

چوکنے رہتے ہیں لیکن اگر کوئی گھر میں ہی چور ہو تب تو اس سے بچنا نہایت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

یہی حال ان فرق باطلہ کا بھی ہے اسی لیے ان کے بارے میں سخت حکم ہے،

حدیث پاک میں آیا ہے: لَا تُوَاكِلُوهُمْ وَلَا تُشَارِبُوهُمْ وَلَا تُنَاكِحُوهُمْ، وَلَا تُصَلُّوا عَلَيْهِمْ، وَلَا تُصَلُّوا مَعَهُمْ. (کنز العمال)

ترجمہ: ان کے ساتھ نہ کھاؤ، نہ پیو، نہ اس سے نکاح کرو، نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو۔

﴿وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ [النساء:۱۵۷]

ترجمہ: اوران کے اس کہنے پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو شہید کر دیا۔

اعتراض: ا۔ یہاں یہودیوں کا قول ذکر کیا گیا کہ انہوں نے کہا: ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کر دیا، لیکن وہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ پاک کا رسول مانتے ہی نہ تھے وہ صاف صاف انکار کرتے اور کہتے تھے کہ یہ جادو گرنی کا بیٹا جادوگر ہے۔

جواب: ہاں! حقیقت یہی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول نہیں مانتے تھے، لیکن یہاں انہوں نے استہزا کے طور پر کہا کہ لوگو! ان کو تم اللہ کا رسول مانتے ہو تو ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کر دیا۔

۲۔ یہ اللہ رب العزت کا قول ہے ایسا نہیں کہ یہ یہود کا قول ہو اور بطور حکایت بیان کیا گیا ہو۔ (تفسیر ابن جوزی)

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء:۱۶۵]

ترجمہ: (ہم نے) رسول خوشخبری دیتے اور ڈراتے (بھیجے) تا کہ رسولوں کو (بھیجنے) کے بعد اللہ کے یہاں لوگوں کے لیے کوئی عذر نہ رہے۔

اعتراض: لوگوں کے لیے عذر تو اللہ کے رسولوں کے بھیجنے سے پہلے بھی نہیں ہوسکتا ہے چونکہ اللہ رب العزت کی معرفت کے لیے بے شمار دلائل ہیں بندہ جہاں نظر اٹھا کر دیکھے تو اسے اللہ رب العزت کے جلوے نظر آتے ہیں جو اس کی معرفت کراتے ہیں۔

جواب: اللہ رب العزت نے انبیا و رسل اور کتابیں بھیجیں ہیں تا کہ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کریں، اور ان کو آمادہ کریں کہ دیکھو جو رب تعالیٰ کی نشانیاں ہیں ان میں غور فکر کرو کہ یہ اللہ پاک کی معرفت کا ذریعہ بنیں گے اور جن چیزوں میں اجمال تھا ان کو تفصیل سے بیان فرما دیا کہ لوگ بآسانی غور و فکر کر سکیں۔

اب اگر اللہ پاک ان انبیا و رسل اور کتابوں کو بھیج کر اتمام حجت نہ فرماتا تو روز قیامت ان کے پاس عذر ہوتا کہ اے رب تعالیٰ! تو نے ان نشانیوں کو واضح کرنے کے لیے اور ان پر آمادہ کرنے کے لیے انبیا و رسل کیوں نہ بھیجے کہ ہم ان کے توسط سے تیری نشانیوں میں غور و خوض کرتے اور پھر تیری

معرفت حاصل کر لیتے۔

قرآن پاک میں ہے۔:

﴿وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى﴾[طٰہٰ:۱۳۴]

ترجمہ: اور اگر ہم انہیں کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے رسول کے آنے سے پہلے تو ضرور کہتے: اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں پر چلتے قبل اس کے کہ ذلیل وخوار ہوتے۔

﴿إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ﴾

[النساء:۱۷۱]

ترجمہ: بے شک مسیح عیسیٰ، مریم کا بیٹا، اللہ کا رسول ہی ہے اور اس کا کلمہ ہے۔

اعتراض: یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ پاک کا کلمہ کہا گیا، لیکن اللہ کا کلمہ وکلام تو اس کی صفت قدیم ہے جو قائم بالذات ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مخلوق اور حادث ہیں تب ان پر کلمہ کا اطلاق کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟

جواب: یہاں کلمہ سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود حضرت مریم کے شکم میں ایک کلمہ کے ذریعہ ہوا، جو اللہ رب العزت کی جانب سے حضرت جبرئیل لے کر آئے اور وہ کلمہ لفظ ''کن'' ہے۔اس آیت میں یہ

بتانا مقصود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ السلام بغیر باپ کے لفظ کن سے پیدا ہوئے۔

حضرت قتادہ سے مروی ہے: و کلمته ألقاها إلی مریم، قال: هو قوله کن'' ترجمہ: وہ کلمہ جو حضرت مریم کی جانب بھیجا، وہ لفظ کن ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے۔

﴿إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾[آل عمران:۴۵]

ترجمہ: اور یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا، اے مریم! اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی۔

❁❁❁❁❁

سورة المائدة

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ [المائدہ: ۱]

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے قول پورے کرو، تمہارے لیے حلال ہوئے بے زبان مویشی مگر وہ جو آگے سنایا جائے گا۔

اعتراض: اس آیت میں عقود سے کیا مراد ہے؟ نیز اس کے فوراً بعد کہا: تمہارے لیے بے زبان مویشی حلال ہیں تو آیت کے دونوں ٹکڑوں کا آپس میں کیا ربط ہے؟

جواب: مفسرین نے عقود کے معنی میں چند قول بیان کیے ہیں:۔

۱۔ ابن جریر طبری نے کہا: یہ اہل کتاب کو خطاب ہے اور معنی یہ ہے کہ اے اہل کتاب! کتب سابقہ میں، میں نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کے متعلق جو تم سے عہد لیا ہے وہ پورا کرو۔

۲۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ خطاب مومنین سے ہے اور عقود سے مراد ایمان اور وہ عہد ہیں جو حرام و حلال کے متعلق قرآن پاک میں لیے گئے، اس قول سے آیت کریمہ کے دونوں جزوں کا ربط بھی واضح ہو گیا کہ حرام و حلال کے متعلق عہد مراد ہے اور پھر ان کی تفصیل کی ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔ اس لیے "أحلت لكم بهيمة الأنعام" سے حلال چیزوں کا تذکرہ کیا اور

"حرمت علیکم المیتۃ" سے حرام چیزوں کا تذکرہ کیا ہے۔

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدہ:۳]

ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے دین کامل کر دیا اور تم پر نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔

اعتراض: یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ یہ قرآن پاک کی آخری آیت ہے کہ دین بھی مکمل ہو گیا، احکام پورے ہو گئے، نعمت بھی کامل ہو گئی ،اس کے باوجود لوگ کیوں کہتے ہیں کہ یہ آخری آیت نہیں ہے۔

جواب: اس بات میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ قرآن پاک کی سب سے آخری آیت کون سی ہے،مفسرین نے مذکورہ آیت کو قرآن پاک کی آخری آیت ہونا تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ یہاں اکمال دین سے مراد احکام مثلاً: حلال وحرام کا مکمل ہو جانا ہے،مزید یہ آیت یہ بتاتی ہے کہ آج اسلام تمام ادیان باطلہ پر غالب آ گیا کہ یہ آیت دس ذی الحجہ، حجۃ الوداع کے موقع پہ نازل ہوئی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمان اور مشرکین سب ایک ساتھ حج کیا کرتے تھے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی تو مشرکین کو بیت اللہ شریف کا حج کرنے سے روک دیا گیا،اس وقت (حجۃ الوداع کے موقع پر) مسلمانوں نے اس حال میں حج کیا کہ ایک بھی مشرک ان کے ساتھ شریک نہ تھا تو "واتممت علیکم نعمتی" سے یہی اتمام نعمت مراد ہے۔ (جامع البیان،ج:۹،ص:۱۹)

اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دو ماہ سے زیادہ باحیات رہے تو بعید لگتا ہے۔ کہ اس عرصہ میں کوئی آیت نازل نہ ہوئی ہو، اسی لیے مفسرین نے فرمایا کہ قرآن پاک کی مطلق آخری آیت یہ ہے۔

﴿ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴾ [البقرة: ۲۸۱]

ترجمہ: اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھرو گے، اور ہر جان کو اس کی کمائی بھر پور دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

اس آیت کریمہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نو دن باحیات رہے اس کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴾ [المائدہ: ۹]

ترجمہ: ایمان والے نیکوکاروں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کے لیے بخشش اور بڑا ثواب ہے۔

اعتراض: یہاں تو یہ کہنا چاہیے کہ ''وَعَمِلُوا السَّيِّئَاتِ'' اس لیے کہ مغفرت تو سیئات اور گناہوں کی ہوتی ہے نہ کہ حسنات کی، ان پر تو اجر وثواب ملتا ہے۔

جواب: کوئی کتنا بھی بڑا صالح، متقی اور پرہیز گار کیوں نہ ہو لیکن گناہ صغیرہ یا کبیرہ کے ارتکاب سے خالی نہیں، اس اعتبار سے آیت کا معنی یہ ہوا: جو ایمان لائے اور نیک کام کیے تو ان کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ اس لیے

کہ ”إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ“ [هود:۱۱۴] کہ بے شک نیکیاں برائیوں کومٹادیتی ہیں۔

﴿ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ ﴾

ترجمہ: بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا، اور روشن کتاب، اللہ اس کے ذریعہ اسے سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے جو اللہ کی مرضی کا تابع ہو جائے۔

اعتراض: جب اللہ پاک بندہ کو ہدایت دیتا ہے تبھی وہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی پر چلتا ہے، اور اس کے احکام کی بجا آوری کرتا ہے۔ یہاں کہا کہ جو اللہ کی رضا مندی پر چلتا ہے اسے رب تعالیٰ ہدایت دیتا ہے، تب تو دور لازم آرہا ہے۔

جواب: اللہ رب العزت تو علام الغیوب ہے وہ بندوں کے بارے میں جانتا ہے کہ کون میری اتباع کرے گا اور کون منہ پھیرے گا۔ لہذا جس کے بارے میں یہ ہو کہ وہ اتباع کرے گا رب تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کرے گا، تو اس کو قرآن پاک کے ذریعہ سے ہدایت دے دیتا ہے، اور جس کی بابت یہ معلوم ہے کہ منھ پھیرے گا تو اس کو ہدایت سے نہیں نوازتا ہے۔

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ﴾ [المائدہ:۱۸]

ترجمہ: تم فرمادو پھر تمہیں کیوں تمہارے گناہوں پر عذاب فرماتا ہے۔

اعتراض: یہ دلیل یہود و نصاری کے خلاف حجت نہیں ہو سکتی ہے اس لیے کہ وہ تو خود عذاب کی نفی کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہم جو گناہ دن میں

کرتے ہیں وہ رات میں معاف ہو جاتے ہیں۔ اور جو رات میں کرتے ہیں وہ دن میں معاف ہو جاتے ہیں۔

جواب: ۱۔ ہود ونصاری مطلقاً عذاب کا انکار نہیں کرتے تھے، چالیس روز جوانہوں نے گاے کی عبادت کی تھی اس کے بدلے چالیس روز عذاب کے تو وہ بھی قائل تھے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾[البقرہ:۸۰]

ترجمہ: بولے کہ ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن۔

۲۔ یا آیت کریمہ میں عذاب سے وہ دنیوی عذاب مراد ہے جو ان پر اتارا گیا کہ بعض کی صورتیں مسخ کر کے بندر بنا دیئے گئے، اور قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا، اس عذاب کا وہ بھی اقرار کرتے تھے کہ ان کے آبا واجداد پر اس طرح کا عذاب نازل ہوا تھا۔

﴿فَتَوَكَّلُوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾[المائدہ:۲۳]

ترجمہ: تو اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ایمان کو توکل پر معلق کر دیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو توکل نہ کرے وہ مومن نہیں ہے جبکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔

جواب: اس آیت کریمہ میں ''اِنْ'' ''اِذْ'' کے معنی میں ہے اب معنی ہوا کہ جب مومن ہو تو اللہ پاک پر توکل کرو، اس لیے کہ توکل کرنا مومنین کی علامت ہے وہ ہر معاملہ میں اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

﴿اُدۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَةَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمۡ ﴾[المائدہ:۲۱]

ترجمہ: (موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اے میری قوم) اس پاک سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔

اعتراض: اس آیت میں یہ فرمایا کہ بنی اسرائیل کے لیے وہ زمین اللہ پاک نے لکھ دی ہے لیکن آگے آیت میں فرمایا: ” فانها محرمة عليهم “ [المائدہ:۲۶] کہ یہ زمین ان کے لیے حرام کر دی گئی ہے۔[المائدہ:۲۶]

ان دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے۔

جواب: ۱۔ اللہ پاک نے وہ زمین بنی اسرائیل کے لیے اس شرط پر لکھی تھی کہ وہ جا کر اس کے باشندوں سے جنگ کریں لیکن بنی اسرائیل نے جنگ سے انکار کر دیا اس لیے وہ زمیں ان کے لیے حرام ہو گئی تھی۔

۲۔ یہاں تحریم مطلقاً نہیں تھی بلکہ موقت تھی اور اللہ پاک نے ان کے لیے جو رہنا لکھا تھا وہ اس مدت کے بعد تھا کہ چالیس سال تک ان کے اوپر زمین حرام رہے گی، وہ ادھر اُدھر بھٹکتے رہیں گے اس کے بعد اس میں رہیں گے

۳۔ یا اس آیت میں عام بول کر خاص مراد لیا گیا ہے کہ بعض فرماں بردار تھے ان کے لیے اس میں رہنا لکھ دیا اور بعض جو نافرمان تھے ان کے لیے حرام فرما دیا۔

﴿اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِکَ فَتَکُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ

النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ [المائدۃ: ۲۹]

ترجمہ: میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرا اور تیرا گناہ دونوں تیرے اوپر ہی پڑ جائیں تو دوزخی ہو جائے، اور بے انصافوں کی یہی سزا ہے۔

اعتراض: کسی کے لیے بھی گناہ کا ارادہ کرنا یا کسی کے لیے گناہ میں مبتلا ہونے کی تمنا کرنا جائز نہیں ہے حالانکہ اس آیت میں ہابیل نے اپنے بھائی کے لیے یہ ارادہ کیا۔

جواب: ا۔ہابیل کے قول کا مطلب سمجھنے سے پہلے ایک حدیث پاک میں غور کریں:

بخاری شریف کی حدیث پاک ہے حضرت احنف بن قیس بیان کرتے ہیں کہ میں اس شخص (حضرت علی) کی مدد کے لیے روانہ ہوا۔ تبھی حضرت ابو بکرہ سے میری ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا میں ان کی مدد کے لیے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا واپس جاؤ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

إذا التقى المُسْلِمَانِ بِسَيفَيهِمَا، فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم هذا القاتل فمَا بَالُ المَقْتُول؟ قَالَ: انه كان حَرِيصًا عَلٰى قتل صاحبه.

ترجمہ: جب دو مسلمان تلواروں سے قتال کریں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخ میں جائیں گے۔

میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو قاتل ہے، لیکن مقتول

کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ بھی تو اپنے حریف کے قتل پر حریص تھا۔
[صحیح بخاری، کتاب الوفات، رقم الحدیث: ۶۸۷۵]

اب آیت کا مطلب سمجھو: ہابیل کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے قتل پر حریص نہیں ہوں، لہذا وہ گناہ جو میرے حریص ہونے کی صورت میں مجھے لاحق ہوتا، میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی تم کو لاحق ہو اس لیے کہ صرف تم میرے قتل پر حریص ہو۔

۲۔ یا پھر اس آیت میں حرف نفی مضمر ہے اور آیت کا معنی یہ ہے:

میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا اور تیرا دونوں کا گناہ تیرے سر نہ پڑے اس کی تائید اللہ پاک کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ.[النحل:۱۵]

ترجمہ: اور اس نے زمین میں لنگر ڈالے تو کہیں تمہیں لے کر نہ کانپے۔

اس آیت میں بھی حرف نفی مضمر ہے اسی لیے نفی کے ذریعہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

﴿ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ﴾[المائدۃ: ۳۱]

ترجمہ: تو (قابیل) شرمندہ ہونے والوں میں سے ہو گیا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرنے کے بعد توبہ کر لی تھی، اس کو ندامت وشرمندگی ہوئی، اور گناہ کرنے کے بعد ندامت وشرمندگی ہونا اسی کا نام توبہ ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: ’’الندم توبۃ‘‘ کہ ندامت توبہ ہے۔

جواب: ۱۔ قابیل کو اپنے بھائی کے قتل پر ندامت نہیں ہوئی تھی بلکہ قتل

کے بعد اس کی لاش کو ایک سال تک اٹھائے پھرتا رہا اس کی تدفین کے بارے میں بھی نہ جانتا تھا یہاں تک کہ ایک کوّے نے تدفین کا طریقہ بتایا تو اس امر پر اسے ندامت ہوئی کہ وہ ایک کوّے کی مانند بھی نہ ہو سکا۔

۲۔ یا اس کو اس بات پر ندامت ہوئی کہ اس کا بھائی دنیا سے چلا گیا لہذا اس کو اپنے گناہ پر شرمندگی نہ تھی کہ اسے توبہ تسلیم کر لیا جائے اور اگر تسلیم کر لیا جائے تو ممکن ہے کہ ان کی شریعت میں ندامت توبہ ہی نہ شمار کی جاتی ہو اور یہ صرف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاصہ ہو۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ توبہ کے لیے تین شرائط ہیں:

اول: گناہ پر شرمندگی۔

دوم: فوراً اس گناہ کو چھوڑ دے۔

سوم: آئندہ اس گناہ کی طرف نہ لوٹنے کا عزمِ مصمم کر لے۔

اور حدیث شریف میں جو فقط ندامت و شرمندگی کو توبہ کہا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کے سب سے عظیم رکن کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جس طرح فرمایا: الحج عرفۃ کہ حج صرف عرفہ کا نام ہے جب کہ حج کے اور بھی ارکان ہیں، لیکن عرفہ ایک عظیم رکن ہے اسی لیے عرفہ کا ذکر فرمایا، اسی طرح توبہ کے بہت ارکان و شرائط ہیں لیکن ندامت ایک عظیم رکن ہے۔

﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ [المائدۃ:۳۳]

ترجمہ: یہی بدلہ ہے ان کا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں۔

اعتراض: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار و مشرکین کا جہاد کرنا تو

سمجھ میں آتا ہے لیکن اللہ پاک سے اس طرح جہاد کرنا ناممکن ہے یہ امر تو غیر متصور ہے تو اس آیت کا پھر کیا معنی ہے؟

جواب: ا۔ یہاں مراد اللہ تعالیٰ کے اولیا سے جہاد کرنا ہے کہ جو اللہ کے رسول اور اس کے اولیا سے جہاد کرے گا وہ اللہ سے جہاد کے مانند ہوگا۔

۲۔ یا یہاں محاربہ اور جنگ سے دشمنی مراد ہے نہ کہ حقیقی جنگ اس لیے کہ جنگ دشمنی کے سبب ہی ہوا کرتی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ﴾ [المائدہ: ۳۶]

ترجمہ: بے شک وہ جو کافر ہوئے جو کچھ زمین میں ہے وہ سب اور اس کی برابر اور اگر ان کی ملک ہو کہ اسے دے کر قیامت کے عذاب سے اپنی جان چھڑائیں تو ان سے نہ لیا جائے گا۔

اعتراض: اس آیت میں ''ما فی الارض اور ومثلہ'' دو چیزوں کا ذکر ہوا ہے اور ''لیفتدوا بہ'' میں ضمیر انھیں دونوں کی طرف عائد ہے، تو اس لحاظ سے تثنیہ کی ضمیر ہونی چاہیے تھا؟

جواب: ا۔ واحد کی ضمیر اس لیے لائے کہ یہاں جنس مراد ہے اور جنس کا اطلاق واحد، تثنیہ اور جمع سب پر ہوتا ہے۔

۲۔ یہاں ضمیر کو اسم اشارہ ''ذلك'' کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے گویا یوں کہا ''لیفتدوا بذلك'' اور ذلک اسم اشارہ سے واحد، تثنیہ اور جمع سب کی

طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۳۔اہل عرب کے یہاں یہ استعمال ہے کہ کبھی وہ واحد بول کر تثنیہ بھی مراد لیتے ہیں جس کی کئی مثالیں ہیں،قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ﴾ [ق:۱۷]

ترجمہ: جب اس سے لیتے ہیں دو لینے والے ایک داہنے بیٹھا اور ایک بائیں۔

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر ہے تو قعیدان ہونا چاہیے تھا۔

﴿وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ﴾ [ق:۴۷]

ترجمہ:اور چاہیے کہ انجیل والے حکم کریں اس پر جو اللہ نے اس میں اتارا۔

اعتراض: اس آیت میں حکم ہے کہ انجیل والے انجیل کے احکامات پر عمل کریں۔لیکن جب قرآن پاک نازل ہوا تو ان سب کتابوں کے احکام منسوخ ہو گئے پھر کیوں ان پر عمل کرنے کو کہا جا رہا ہے، بلکہ اب تو ان کو یہ حکم ہونا چاہیے کہ اہل تورات وانجیل بھی قرآن کے احکام پر عمل کریں۔

جواب: ۱۔اس آیت میں مطلق انجیل کے احکام پر عمل کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس میں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ذکر تھیں،اور آپ پر ایمان لانے کا تذکرہ تھا وہ مراد ہے، انجیل کے یہ احکام منسوخ نہیں ہوئے تھے۔

۲۔ یا مراد یہ ہے کہ اہل انجیل اس کے ان احکام پر عمل کریں جن کو قرآن کریم نے منسوخ نہ کیا ہو۔

﴿فَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ﴾ [المائدہ: ۴۹]

ترجمہ: پھر اگر وہ منہ پھیریں تو جان لو کہ اللہ ان کے بعض گناہوں کی سزا ان کو پہنچانا چاہتا ہے۔

اعتراض: یہاں کہا گیا کہ کفار کے بعض گناہوں کی سزا رب تعالیٰ ان کو پہنچائے گا حالانکہ صرف بعض گناہ کی ہی تخصیص نہیں بلکہ ان کے ہر ہر گناہ کا بدلہ اور سزا رب تعالیٰ دے گا۔

جواب: ہاں ! کفار و مشرکین کے ہر ہر گناہ کی سزا ان کو ملے گی اور عذاب دیا جائے گا البتہ اس آیت کریمہ میں دنیوی عذاب مراد ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی سزا اللہ پاک دنیا میں ہی دے دیتا ہے مثلاً: ان کو جلاوطن کرنا ،ان کو قتل کرنا وغیرہ۔

رہا ان کے کفر و شرک کا گناہ تو دنیا میں اس کا عذاب متصور نہیں یہ تو روز قیامت ہی ان کو دیا جائے گا۔

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ﴾

ترجمہ: جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کے سوا ان کھالیں ان کو بدل دیں گے کہ عذرت کا مزہ لیں۔

﴿ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ﴾[المائدہ: ۵۱]

ترجمہ: اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ انہیں میں سے ہے۔

اعتراض: کفار و مشرکین و دیگر مذاہب والوں سے دوستی رکھنے کا کیا مطلب ہے۔؟ کیا کوئی کافر سے دوستی یا محبت کرے تو وہ کافر ہو جائے گا یا یہودی یا نصرانی سے دوستی کرے تو یہودی یا نصرانی ہو جائے گا؟

جواب: کسی قوم سے مشابہت اختیار کرنے اور اس پر اسی قوم کا ہونے کی تین صورتیں ہیں۔

اول: کسی قوم سے مشابہت اختیار کرنے والا اس قوم کو محبوب جانتا ہو، اس پر رضامندی کے ساتھ اس سے مشابہت کو پسند بھی کرتا ہو تب حکم یہ ہے کہ اگر وہ قوم مبتدع ہے تو یہ مبتدع، اور اگر کافر ہے تب یہ کافر کہلائے گا اسی کی بابت حدیث پاک میں آیا ہے۔''**من تشبہ بقوم فھو منھم** '' کہ جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرے تو وہ انہی میں سے شمار ہوگا۔

دوم: کسی مقصد اور ضرورت کے تحت کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے تو وہاں اس کی ضرورت اور اس وضع کی شناعت کا موازنہ کیا جائے گا، اگر ضرورت غالب ہے تو بقدر ضرورت تشبیہ اختیار کرنا جائز ہوگا مثلاً: صحابہ کرام سے مروی ہے کہ بعض فتوحات میں رومیوں کے لباس پہن کر بھیس بدل کر کام کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے کفار و مشرکین کی بھاری جماعتوں پر باذن اللہ غلبہ پایا کرتے تھے۔

اسی طرح مروی ہے کہ سلطان صلاح الدین یوسف انار اللہ تعالیٰ کے

زمانے میں جب تمام کفار یورپ نے سخت شورش مچا رکھی تھی تو دو عالموں نے پادریوں کی وضع بنا کر دورہ کیا اور اس آتش تعصب کو بجھا دیا۔

سوم: مشابہت اختیار کرنے والا نہ تو اس قوم کو اچھا جانتا ہے اور نہ ضرورت شرعیہ ہے بلکہ صرف کسی دنیوی نفع کے لیے یا صرف بطور ہنسی مذاق، اس کا مرتکب ہوا تو حرام وممنوع ہونے میں شک نہیں ہے، اور اگر وہ وضع ان کفار کا اپنا شعار ہو مثلاً: زنار، قشقہ، چٹیا وغیرہ تو اس صورت میں بھی حکم کفر لگے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِي الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ﴾ [المائدہ: ۵۱]

ترجمہ: بے شک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔

اعتراض: لیکن دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے ایسے ظالم ہیں کہ اللہ پاک نے ان کو ہدایت دی تو وہ توبہ کر کے اپنے ظلم سے باز آ گئے اور ہدایت پا گئے۔

جواب: ۱۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ظالمین جب تک اپنے ظلم پر قائم رہیں گے اللہ پاک ان کو ہدایت نہ دے گا۔

۲۔ یا یہ معنی ہے کہ جن کی تقدیر میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ گمراہی پر ہی اس کو موت آئے گی اس کو اللہ پاک ہدایت سے نہیں نوازے گا۔

۳۔ یا ظالمین سے مراد مشرکین ہیں کہ قرآن پاک میں ہے ''اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ '' اور معنی یہ ہے کہ رب تعالیٰ ان کو جنت کی طرف ہدایت نہ دے گا۔

﴿قُلۡ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ مَثُوۡبَةً عِنۡدَ اللّٰهِ﴾ [المائدۃ: ۶۰]

ترجمہ: اے محبوب! تم فرما دو: کیا میں تمہیں وہ لوگ نہ بتاؤں جو اللہ کے یہاں سب سے بدتر ثواب میں ہیں۔

اعتراض: مثوبہ اور ثواب یہ تو نیکیوں کے بدلے کے ساتھ خاص ہے کہ بندہ نیک اعمال کرتا ہے تب اللہ پاک اس کو ثواب عطا فرماتا ہے لیکن مذکورہ آیت میں اس کو برائی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

جواب: ہمیں تسلیم نہیں ہے کہ ثواب اور مثوبہ نیکی کے ساتھ خاص ہے بلکہ اس سے مراد مطلقاً بدلہ ہے خواہ نیکی پر ہو یا برائی پر، اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلۡ ثُوِّبَ الۡكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفۡعَلُونَ﴾[المطففین: ۳۶]

ترجمہ: کیوں کچھ بدلا ملا کافروں کو اپنے کیے کا۔

﴿ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّاۢ بِغَمٍّ ﴾[آل عمران: ۵۳]

ترجمہ: تو تمہیں غم کا بدلہ غم دیا۔

ان دونوں آیتوں میں بھی لفظ ثواب مطلقاً بدلہ کے لیے استعمال ہوا ہے اسی طرح اوپر والی آیت میں بھی ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالباً مثوبہ کا استعمال نیکیوں کے بدلہ کے لیے ہوتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾[المائدہ: ۶۷]

ترجمہ: اور اللہ تمہاری حفاظت فرمائے گا لوگوں سے۔

اعتراض: آیت میں یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم

کی حفاظت فرماتا ہے لیکن پھر دشمنوں نے آپ کو اتنی اذیتیں کیوں پہنچائیں حتی کہ غزوہ احد میں آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے۔

جواب : ا۔اس آیت کے شان نزول سے اس کا جواب واضح ہو جائے گا۔

کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے،اسی لیے آپ جب سفر پر تشریف لے جاتے تو رات میں آپ کے ارد گرد پہرہ دیا جاتا تھا لیکن جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی،تو آپ نے پہرہ داروں سے فرمایا کہ تم لوگ اب چلے جاؤ اللہ پاک نے میری حفاظت فرمائی ہے۔

اب آیت کا معنی واضح ہو گیا کہ اللہ پاک نے قتل سے آپ کی حفاظت فرمائی ہے کہ کوئی آپ کو شہید نہیں کر سکتا ہے البتہ دیگر اذیتیں اور تکلیفیں تو لاحق ہو سکتی ہیں۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ غزوہ احد کے بعد نازل ہوئی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ اُحد میں یہ تکلیف پہنچ چکی تھی کہ آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے تھے۔

محمد بن کعب قرظی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک اعرابی نے حضور کے پاس آ کر اپنی تلوار نیام سے نکالی اور بولا: اے محمد! آج تمہیں مجھ سے کون بچائے گا،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ! تبھی اس اعرابی کے ہاتھوں پر لرزہ طاری ہو گیا،تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی،اور وہ اپنا سر درخت میں مارنے لگا یہاں تک کہ اس کا دماغ پھٹ گیا،

اس وقت اللہ پاک نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

﴿ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ ﴾[المائدہ:۹۵]

ترجمہ: یہ قربانی ہو کہ کعبہ کو پہنچتی۔

اعتراض: یہاں ذکر ہے کہ قربانی کعبہ کو پہنچے جبکہ صرف حرم میں پہنچنا شرط ہے کعبہ کو نہیں بلکہ عین کعبہ میں تو قربانی کرنا ہی جائز نہیں ہے۔

جواب : اس آیت کریمہ میں مراد یہی ہے کہ حرم کعبہ میں قربانی کی جائے ،اور یہاں کعبہ معظّمہ کی تعظیم کے لیے اس کی طرف نسبت کر دی گئی ہے۔

۲۔ یا یہاں حذف مضاف ہے اصل عبارت یوں ہے:هو بالغ حرم الكعبة.

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا﴾[المائدہ:۱۰۹]

ترجمہ: جس دن اللہ جمع فرمائے گا رسولوں کو پھر فرمائے گا تمھیں کیا جواب ملا عرض کریں گے ہمیں کچھ علم نہیں۔

اعتراض: روز قیامت انبیاے کرام علم کی نفی کریں گے، جبکہ وہ سب جانتے ہیں کہ ان کی امت نے ان کو کیا جواب دیا۔

جواب: انبیاے کرام بارگاہ الٰہی میں کمال ادب سے علم کی نفی کریں گے اور علم الٰہی کے حضور اصلاً اپنے علم کو نظر میں نہ لائیں گے اور اس کو اللہ رب العزت کے سپرد کریں گے۔

۲۔ یا معنی یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں اپنی امتوں کے دیئے ہوئے جوابات

کے باطن کا علم نہیں یعنی ان کے دلوں کے حال کا علم نہیں ہے سوائے اس کے جو تو نے ہمیں بتایا ہے۔

۳۔ یا قیامت کی ہولنا کی اور خوف و دہشت سے ان کو اپنے علم سے ذہول ہو جائے گا اس لیے وہ عرض کریں گے کہ ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ لیکن نحاس نے اس تیسرے جواب پر اعتراض کیا ہے کہ یہ جواب درست نہیں ہے اس لیے کہ انبیائے کرام کو روز قیامت کوئی خوف وغم یا کسی طرح کی دہشت نہ ہوگی، اور نہ اپنے علم سے ذہول ہوگا۔

پھر اس کے جواب میں کہا گیا کہ روز قیامت اکثر مقامات پر انبیا کرام کو کسی طرح کا خوف وغم نہ ہوگا لیکن بعض مقامات پر ان پر بھی خوف طاری ہوگا۔ اس کی تائید میں اس حدیث پاک سے استدلال کیا۔

روایت میں آیا ہے

یحیی بن عبد الرحمن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں: ہم مسجد میں کعبِ احبار کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، وہ ہمیں کچھ بیان کر رہے تھے، اتنے میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ آئے اور لوگوں کے ایک کنارے پر بیٹھ گئے۔ آواز دی اور کہا: "وَيحَک يا كعبُ خوّفنا" (یعنی: ہائے افسوس اے کعب! ہمیں اللہ کا خوف دلاؤ، ہمیں ڈراؤ)

تو کعب احبار نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قیامت کے دن جہنم کو قریب لایا جائے گا، اس کی زفیر (ایک طرح کی سانس کی آواز) اور شہیق (چیخنے کی آواز) ہوگی۔ جب اسے قریب لایا

جائے گا اور مزید نزدیک کیا جائے گا، تو وہ ایسی دھاڑ مارے گی کہ اللہ کی ساری مخلوق میں سے کوئی نبی، کوئی صدیق، کوئی شہید ایسا نہ ہوگا جو گھٹنوں کے بل نہ گر جائے۔ ہر نبی، ہر صدیق اور ہر شہید کہے گا: اے اللہ! آج میں تجھ سے صرف اپنی نجات کا سوال کرتا ہوں، اور اگر اے ابنِ خطاب! تمہارے پاس ستر انبیاء کا عمل بھی ہوتا، تو بھی میں یہی گمان کرتے کہ تم بچ نہ سکو گے۔

یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! معاملہ واقعی بڑا سخت ہے! (مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب ذکر النار، رقم الحدیث 34128)

ایک روایت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جبرئیل نے قیامت کا اتنا خوف دلایا کہ میں رونے لگا۔ میں نے کہا اے جبرئیل! کیا میرے اگلے اور پچھلے گناہ کی مغفرت نہ کر دی گئی؟ تو انہوں نے جواب دیا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ قیامت کی ہولنا کیوں کو ضرور دیکھیں گے جو آپ کو آپ کی مغفرت بھلا دیں گی۔

﴿اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [المائدہ: ۱۱۲]

ترجمہ: جب حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا آپ کا رب استطاعت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان اتارے۔

اعتراض: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تو آپ پر دل و جان سے ایمان لائے تھے ان کے بارے میں قرآن پاک میں ہے "قَالُوْا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ" [سورۃ المائدۃ: ۱۱۱] بولے کہ ہم ایمان لائے

اور (اے عیسیٰ) آپ گواہ ہوجائیں کہ ہم مسلمان ہیں۔اس کے باوجود انہوں نے اللہ رب العزت کی قدرت میں شک کیا جبکہ قدرت باری تعالی میں اس طرح شک کرنا کفر ہے، نیز انہوں نے باری تعالیٰ کو استطاعت سے بھی موصوف کیا جبکہ یہ اعضا اور جوارح کے ساتھ خاص ہے۔

جواب: اولاً تو یہ جان لو کہ ''هَلۡ يَسۡتَطِيۡعُ رَبُّكَ ''میں دو قراءت ہیں ایک صیغہ غائب کے ساتھ اور ''ربک'' کو فاعل بنا کر،اور دوسری قراءت '' هَلۡ تَسۡتَطِيۡعُ رَبَّكَ '' ہے،صیغہ حاضر کے ساتھ اور ربک کو منصوب مان کر۔

دوسری قراءت میں تو معنی واضح ہے کہ حواریوں نے کہا اے عیسیٰ بن مریم! کیا آپ استطاعت رکھتے ہو کہ اپنے رب سے ہمارے لیے ایک دستر خوان کا سوال کرو،لہذا اس قراءت میں تو معنی واضح ہے کہ استطاعت کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے۔

رہی اول قراءت تو وہاں استطاع اطاع یعنی قبول کرنے کے معنی میں ہے اب آیت کا معنی ہوا: اے عیسیٰ! کیا آپ کا رب یہ قبول فرمائے گا اگر تم اس سے ایک دستر خوان کا سوال کرو۔

۲۔ یا یہاں یہی مراد ہے کہ کیا آپ کا اللہ اس پر قادر ہے،لیکن یہ سوال ابتدا کا تھا جس وقت انہیں احکام الٰہی کی معرفت حاصل نہ ہوئی تھی۔اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی غلطی پر زجر وتوبیخ کرتے ہوئے فرمایا:'' قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ '' [المائدہ: ۱۱۲] یعنی اللہ سے ڈرو، اگر ایمان رکھتے ہو۔

﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾[سورة المائدة:۱۱٦]

ترجمہ: (عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ) تو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے نفس میں ہے۔

اعتراض: یہاں اللہ رب العزت کے لیے نفس کا اطلاق کیا گیا ہے، نفس کے لیے تو جسم لازم ہے اس لیے کہ نفس کہتے ہیں اس جوہر کو جو قائم بالذات ہو اور جسم سے متعلق ہو، اور اللہ تبارک وتعالیٰ جسم سے پاک ہے۔

جواب: نفس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔

اول: جس کے لیے جسم لازم ہو۔

دوم: نفس کا اطلاق شئ کی حقیقت اور ذات پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: نفس الذهب والفضة محبوبة: اور مراد ذات ہوتی ہے، لھذا اس آیت میں یہی دوسرا معنی مراد ہے۔

﴿قَالَ اللَّهُ هَٰذَا يَوْمُ يَنفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ﴾ [سورة المائدة:۱۱۹]

ترجمہ: اللہ نے فرمایا: یہ قیامت کا م دن ہے جس میں سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا۔

اعتراض: سچ تو دنیا میں بھی نافع ہے آخرت میں بھی، تو پھر حصر کے ساتھ آخرت میں سچ کے نفع کو خاص کیوں کیا؟

جواب : سچائی انسان کو دنیا میں بھی نفع دے گی اور آخرت میں بھی، لیکن آخرت میں سچائی کے نفع سے مراد یہ ہے کہ انہیں سچائی کا اجر ملے گا، جنت ملے گی اور جہنم سے آزادی ملے گی تو آخرت کے اس فائدے کے بالمقابل دنیا کا فائدہ بالکل کالعدم ہے اسی لیے آخرت کے ساتھ خاص کیا۔

❁❁❁❁❁

سورة الأنعام

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ﴾[سورة الأنعام: ۱]

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے اور اندھیروں اور نور کو پیدا کیا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ظلمات کو جمع لائے اور نور کو واحد جبکہ مناسب تھا کہ اول کو جمع لائے تو اس کے مقابل نور کو بھی جمع لاتے۔

جواب: ۱۔ظلمة اسم ہے اور اسم کی جمع آتی ہے اسی لیے اس کی جمع لائے ہیں جبکہ نور مصدر ہے اور مصدر کی جمع نہیں آتی بلکہ اس کا اطلاق واحد، تشنیہ اور جمع سب پر ہوتا ہے۔

۲۔لفظ ظلمات کو جمع لائے اور جمع کا صیغہ اپنے مابعد پر بھی دلالت کرتا ہے اسی لیے بعد میں لفظ نور کو ذکر کرنے میں جمع کا صیغہ نہ لائے اس لیے کہ ماقبل ظلمات کی دلالت اس پر ہو رہی ہے، اور اسی طرح ''خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ'' میں ہے کہ سماوات کو جمع لائے اور ارض کو واحد کہ اول جمع مابعد پر دلالت کر رہی ہے۔

﴿قُلِ اللّٰهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ﴾[سورة الأنعام: ۱]

ترجمہ: اے محبوب! تم فرمادو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔

اعتراض: مدعی اگر اپنے دعویٰ پر اللہ رب العزت کو گواہ بنائے تو اس

کے صحت دعویٰ میں گواہی کافی نہ ہوگی مثلاً: کوئی اللہ کو گواہ بنا کر یا اللہ ورسول کو گواہ بنا کر نکاح کرے تو منعقد نہ ہوگا، پھر یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی کیونکر صحیح ہوگئی کہ آپ نے فرمایا: میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔

جواب: غیر نبی کے لیے رب تعالیٰ کی گواہی اس کے دعویٰ کی صحت پر کافی نہ ہوگی لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اللہ رب العزت کی گواہی کافی ہوگی اس لیے کہ ہم اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ اللہ کے گواہ ہونے پر دلیل قائم کریں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر دلیل قائم کرسکتے ہیں چونکہ آپ کے پاس وحی آتی ہے، اللہ پاک کے اس ارشاد ہے:

''وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ'' [سورۃ الأنعام: ۱۹] کہ میری طرف اس قرآن کی وحی کی گئی ہے۔

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً﴾ [سورۃ الأنعام: ۳۷]

ترجمہ: اور (کفار مکہ) بولے ان پر کوئی نشانی کیوں نہ اتری ان کے رب کی طرف سے۔ تم فرماؤ کہ اللہ قادر ہے کہ کوئی نشانی اتارے۔

اعتراض: کفارے مکہ نے جب سوال کیا کہ تمہارا خدا کوئی نشانی کیوں نہیں اتارتا، جواب میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے اتارنے پر قادر ہے، لیکن یہ جواب سوال کے مطابق نہیں ہے چونکہ ایسے تو کوئی بھی نبوت کا دعویٰ کردے اور جب اس سے معجزہ طلب کیا جائے تو

کہہ دے میرا خدا اس کے اتارنے پر قادر ہے۔

جواب: اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جب نبوت ثابت نہ ہوئی ہوتی لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اس سے قبل ہی بے شمار معجزات و دلائل کے ذریعہ ثابت ہو چکی تھی اس کے بعد آپ نے کفار قریش کو یہ جواب دیا، لہذا آپ کا اس طرح جواب دینا بالکل درست ہے۔

﴿وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ﴾[سورة الأنعام:۳۸]

ترجمہ: اور نہیں ہے کوئی زمین میں چلنے والا جانور اور نہ ہی اپنے پروں کے ساتھ اڑنے والا کوئی پرندہ مگر وہ تمہاری جیسی امتیں ہیں۔

اعتراض: ہر چوپایہ اور جانور زمین پر ہی چلتا ہے، اور اسی طرح ہر اڑنے والا پرندہ پروں کے ذریعہ سے ہی اڑتا ہے۔ اس کے باوجود اس آیت کریمہ میں فی الأرض اور "بجنا حیه" کی قید ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: اس طرح کی قیود تاکید کے لیے ذکر کی جاتی ہیں اور کلام عرب میں اور خود قرآن عظیم میں اس طرح کی تعبیرات بکثرت پائی جاتی ہیں مثلاً:

هٰذِه نعجة انثى

مشيت بر جلى

لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰهَيۡنِ اثۡنَيۡنِ[سورة النحل:۵۱]

﴿يَقُولُونَ بِأَلۡسِنَتِهِم مَّا لَيۡسَ فِي قُلُوبِهِمۡ﴾[الفتح:۱۱]

۲۔ یا اس سے مراد بالکل عموم رکھنا ہے اور تمام کا احاطہ مقصود ہے گویا کہ

یوں فرمایا ہے: ''جمیع الدورب و جمیع الطیور ''۔

﴿وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ﴾
[سورۃالانعام: ۵۵]

ترجمہ: اوراسی طرح ہم آیتوں کومفصل بیان فرماتے ہیں، اوراس لیے کہ مجرموں کا راستہ واضح ہوجائے۔

اعتراض: یہاں کہا گیا کہ ہم آیتوں کومفصل بیان کرتے ہیں کہ مجرمین کا راستہ واضح ہوجائے بہتر تھا کہ مومنین کے راستہ کا بھی ذکر ہوتا ہے چونکہ وہ بھی تو محتاج بیاں ہےاورقرآن پاک مومنین کےراستےکوبھی بیان کرنے آیاہے۔

جواب: راستے دو ہی ہیں ایک ہدایت کا اور دوسرا ضلالت و گمراہی کا ،مومنین کا راستہ ہدایت کا ہے اور کفار ومشرکین کا گمراہی کا ہے۔ جب ایک راستہ واضح ہوجائے گا تو دوسرا خودبخود واضح ہوجائے گا۔

مذکورہ آیت کریمہ میں یہی مقصود ہے کہ جب مجرمین کا راستہ واضح ہو جائے گا تو مومنین کا بھی واضح ہوجائے گا۔مثلاً مجرمین کا راستہ یہ ہے شراب پینا، زنا کرنا ، جوا کھیلنا اس اسے مومنین کے لیے واضح ہوا کہ ان کا راستہ ہے: شراب ترک کرنا، زنا کے قریب نہ جانا اور جوا نہ کھیلنا۔

﴿وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ [سورۃالانعام: ٦٠]

ترجمہ: اور جو کچھ تم دن میں کماتے ہو وہ (اللہ) اسے جانتا ہے۔

اعتراض: اس آیت میں ''جرحتم ''سے مراد ''کسبتم '' ہے، اب معنی یہ ہوا کہ اللہ پاک بندوں کے دن کی کمائی کے بارے میں جانتا

ہے، لیکن یہاں یہ کیوں کہا گیا کہ اللہ پاک دن کی کمائی کو جانتا ہے حالانکہ وہ تو اسے بھی جانتا ہے جو بندہ رات میں کماتا ہے۔

جواب: آیت میں یہ ذکر ہے کہ اللہ پاک بندے کی دن کی کمائی کی بابت جانتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ رات کی کمائی کا علم نہ ہو، اس لیے کہ اثبات اول نفی ثانی کو لازم نہیں ہے۔

۲۔ یا اس لیے کہ عمومی طور پر بندہ دن میں کسب رزق کے لیے نکلتا ہے چونکہ اللہ پاک نے دن کمانے اور رات آرام کے لیے بنائی ہے۔

ارشاد باری ہے:

﴿وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا﴾

[سورۃالنبا: ۱۰۔۱۱]

ترجمہ: اور رات کو ڈھانپ دینے والی بنایا اور دن کو روزی کھانے کا وقت بنایا۔

پس اسی طرف نسبت کرتے ہوئے دن کا ذکر کر دیا کہ عموماً انسان دن میں کھاتا کماتا ہے۔

﴿مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ﴾ [سورۃ القصص: ۷۲]

ترجمہ: تو اللہ کے سوا کون خدا ہے جو تمہیں رات لا دے جس میں تم آرام کرو؟

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ رات آرام اور دن کسب معاش کے لیے

بنائے گئے ہیں اسی لیے دن کی طرف نسبت کی گئی ہے۔

﴿ثُمَّ رُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ مَوۡلٰٮهُمُ الۡحَـقِّ﴾[سورۃالانعام:٦٢]

ترجمہ: پھر اللہ کی طرف سب کو لوٹا یا جائے گا جو ان سب کا حقیقی مولیٰ ہے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ اللہ پاک ہی سب کا مولیٰ ہے،خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔لیکن دوسری آیت میں فرمایا کہ کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں ہے۔

﴿وَاَنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ لَا مَوۡلٰى لَهُمۡ﴾ [محمد:١١]

ترجمہ: کہ کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں ہے۔

اب دونوں آیتوں کے تعارض کو کیسے دفع کریں؟

جواب: دونوں آیتوں میں لفظ مولیٰ کا معنی الگ الگ ہے، پہلی آیت میں مولیٰ کا معنی ہے: مالک، خالق اور معبود جبکہ دوسری آیت کریمہ میں مولیٰ کے معنی مددگار کے ہیں لہذا اب کوئی تعارض نہیں رہا۔

پہلی آیت کا معنی یہ ہے کہ تمام لوگوں کو اللہ رب العزت کی طرف روز قیامت لوٹا یا جائے گا اور دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ روز قیامت کفار کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔

﴿قَوۡلُهُ الۡحَـقُّ وَلَهُ الۡمُلۡكُ يَوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ﴾[محمد:٧٣]

ترجمہ:اس کی بات سچی ہے اور اس کی بادشاہت ہوگی جس دن صور پھونکا جائے گا۔

اعتراض: اس آیت میں ذکر ہے کہ جس دن صور پھونکا جائے گا اس دن رب تبارک و تعالیٰ کی بادشاہت ہوگی، حالانکہ اللہ رب العزت کی بادشاہت تو ہر وقت اور ہر جگہ ہے۔

جواب: حقیقی بادشاہت اور ملکیت تو صرف اللہ رب العزت کے لیے ہی ہے اور ہر وقت ہے، لیکن اس نے مخلوق میں سے بعض کو اپنی عطا سے عارضی طور پر بادشاہت عطا فرمائی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی بادشاہت کا ذکر قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ ﴾[البقرة:٢٥١]

ترجمہ: اور اللہ نے (حضرت داؤد کو) بادشاہت اور حکمت عطا فرمائی۔

﴿ وَ اللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ﴾[البقرة:٢٤٧]

ترجمہ: اور اللہ جسے چاہے اپنی سلطنت دے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ دنیا میں بعض کو سلطنت عطا فرماتا ہے۔

لیکن جس روز صور پھونکا جائے گا، جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز کسی کو کسی بھی طرح کی ملکیت حاصل نہ ہوگی، صرف وصرف مالک حقیقی کی بادشاہت ہوگی، جو لوگ اس کی بادشاہت کے منکر تھے یا شک کرتے تھے یا دنیوی حاکمیت و بادشاہت کے سبب شیخی مارتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کے منکر تھے، روز قیامت کوئی شک نہ کر سکے گا نہ کوئی انکار کر سکے گا۔

اب اللہ پاک ان سب سے فرمائے گا۔ ''لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ

''[الغافر:۱۶] کہ بتاؤ آج کسی کی بادشاہت ہے؟

ایک جگہ فرمایا: ''وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ''[الانفطار:۱۹] کہ اس دن جب سارا حکم اللہ کا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ﴾[الانعام:۹۲]

ترجمہ: اور جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اس کتاب (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔

اعتراض: اس سے معلوم ہوا کہ جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں، لیکن بہت سے یہود و نصاری ایسے ہیں جو آخرت پر تو ایمان رکھتے ہیں لیکن قرآن پر ایمان نہیں رکھتے۔

جواب: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ صحیح معنوں میں آخرت پر وہی ایمان رکھتا ہے جو اس قرآن پاک پر ایمان رکھتا ہے اور آخر پر ایمان لانا نفع بھی اسی کو دے گا جو اس قرآن مقدس پر بھی ایمان لائے گا، یہود و نصاریٰ جو قرآن پر ایمان نہ رکھیں صرف آخرت پر ایمان لائیں تو ان کا ایمان لانا نفع نہ دے گا۔

تفسیر ماوردی میں اسی آیت کے تحت ہے۔

فإن قيل: فيمن يؤمن بالآخرة من أهل الكتاب لا يؤمنون به؟ قيل: لا اعتبار لإيمانهم بها لتقصيرهم في حقها، فصاروا بمثابة من له يؤمن بها.

ترجمہ: اگر کہا جائے کہ اہل کتاب سے جو آخرت پر تو ایمان رکھتے ہیں

لیکن قرآن پاک پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟

(جواب میں) کہا گیا کہ ان کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس لیے کہ انہوں نے اس کے حق میں کوتاہی کی، پس وہ ان کے مثل ہو گئے جو سرے سے ایمان ہی نہ لائے۔

﴿أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا﴾[الانعام:۱۱۴]

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: تو کیا میں اللہ کے سوا کسی کو حاکم بنالوں؟ حالانکہ وہی ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری ہے۔

اعتراض: کتاب تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اس لحاظ سے یہاں یہ ہونا چاہیے تھا: ''انزل الیَّ الکتاب'' کہ میری طرف کتاب اتاری، جب کہ یہاں لوگوں کی طرف کتاب نازل کرنے کی نسبت کی گئی کہ اے لوگو! تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری ہے۔

جواب: کتاب یعنی قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تاکہ آپ اس کو لوگوں تک پہنچا دیں اور اس کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت دیں۔

اس لحاظ سے گویا کہ قرآن پاک حضور کے واسطے سے لوگوں کی طرف ہی نازل کیا گیا تو لہٰذا لوگوں کی طرف نسبت کرنا درست ہوگا۔

﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ﴾

[الانعام:۱۱۸]

ترجمہ: تو کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔

اعتراض: اس آیت میں مومن ہونے کو ذبیحہ کھانے پر معلق کر دیا گیا جبکہ مومن وہ بھی ہے جو ذبیحہ نہ کھائے۔

جواب: قرآن پاک میں ہر جگہ امر وجوب کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ استحباب اور اباحت وغیرہ کے لیے بھی آیا ہے۔

یہاں اس آیت کریمہ کے نزول کا پس منظر ذکر کیا جاتا ہے جس سے آیت کا معنی واضح ہو جائے گا۔

کفار حرام کو حلال کہتے تھے اور حلال کو حرام کہتے تھے، مردار کو حلال سمجھتے اور ذبیحہ کو حرام۔ مشرکین مکہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم سمجھتے ہو کہ تم اللہ کو پوجنے والے ہو، مگر اللہ جسے مارے (یعنی مردار) وہ زیادہ حقدار ہے کہ اسے کھایا جائے بمقابل اس کے جسے تم ذبح کرتے ہو، تب یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے کو کھاؤ، اور مراد یہ ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھو۔ اس آیت سے یہی بتانا مقصود ہے نا کہ صرف نفس کھانا۔

﴿يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ﴾

[الانعام: ۱۳۰]

ترجمہ: اے جنوں اور آدمیوں کے گروہ! کیا تمہارے پاس تم میں کے رسول نہ آئے تھے۔

اعتراض: تمام رسل انسانوں میں سے آئے ہیں جنوں سے کوئی رسول نہ ہوا پھر اس آیت میں جنات کو مخاطب کر کے کیوں کہا گیا کہ تم میں سے تمہارے پاس کوئی رسول آئے ہیں۔

جواب: یہاں رسل جن سے مراد وہ نہیں جو حقیقی معنی میں رسول ہوں بلکہ جنات کا وہ گروہ مراد ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن سننے آتا تھا اور پھر اپنی قوم کو جا کر بتاتا تاکہ ہم قرآن سن کر آئے ہیں جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا(1) يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ﴾[الجن: ۱-۲]

ترجمہ: تم فرماؤ مجھے وحی ہوئی کہ کچھ جنوں نے میرا پڑھا کان لگا کر سنا تو بولے: ہم نے عجیب قرآن سنا کہ بھلائی کی راہ بتاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔اور ہر گز کسی کو اپنے رب کا شریک نہ کریں گے۔

﴿ وَشَهِدُوْا عَلٰٓى أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴾[الانعام: ۱۳۰]

ترجمہ: اور وہ (کفار) خود اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ہے کہ کافر روز قیامت گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے لیکن سورہ انعام کی ہی ایک دوسری آیت ہے کہ یہ اپنے کفر کا انکار کریں گے۔

ارشاد باری ہے:

﴿وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ [الانعام: ۲۳] کہ ہمیں اپنے رب اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔اب دونوں آیتوں کے تعارض کو کیسے دفع کریں گے؟

جواب: قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، اس دن مختلف مقامات پر ان کو پیش کیا جائے گا تو بعض مقامات پر اپنے کفر و شرک کا اقرار کریں گے اور بعض مقامات پر انکار کریں گے۔

۲۔ یا یہ اپنے کفر و شرک کا انکار کریں گے تب اللہ پاک ان کے مونہوں پر مہر لگا دے گا پھر ان کے اعضا ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ یہ کافر و مشرک تھے۔

اللہ پاک کا ارشاد ہے:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [یس:۶۵]

ترجمہ: آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے، اور ان کے پاؤں ان کے کیے کی گواہی دیں گے۔

﴿قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ [الانعام:۱۴۰]

ترجمہ: بے شک وہ بہکے اور ہدایت پر نہ تھے۔

اعتراض: جب ''قَدْ ضَلُّوْا'' کہہ دیا تو ''ما کانوا مھتدین'' کہنے کا کیا فائدہ ہے؟ جبکہ دونوں کا معنی و مراد ایک ہی ہے۔

جواب: یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ لوگ گمراہ ہو گئے اور گمراہی کے بعد ہدایت نہ پاسکے، اس لیے کہ بعض لوگ گمراہ ہوتے ہیں اور پھر اللہ پاک ان کو ہدایت کی توفیق سے نواز دیتا ہے تو وہ اپنی گمراہی سے باز آجاتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

سورة الأعراف

﴿وَ كَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَهۡلَكۡنٰهَا فَجَآءَهَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ هُمۡ قَآئِلُوۡنَ﴾ [الاعراف:۴]

ترجمہ: اور کتنی ہی بستیاں ہم نے ہلاک کیں تو ان پر ہمارا عذاب رات میں آیا یا جب وہ دو پہر کو سو رہے تھے۔

اعتراض: یہاں کہا گیا کہ جب قوم کو ہلاک کر دیا اس کے بعد عذاب آیا حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ عذاب آنا ہی ہلاکت ہے ورنہ ہلاک کر دینے کے بعد عذاب آنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب : اس آیت کریمہ میں مراد یہ ہے کہ جب ہم نے کسی آبادی (بستی) کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرمایا، تو اس پر عذاب بھیج دیا لہذا یہاں قصد وارادہ محذوف ہے۔

اس کی تائید قرآن پاک کی آیت کریمہ سے ہوتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿یَاۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ وَ اَیۡدِیَكُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ﴾ [المائدہ:٦]

ترجمہ: اے ایمان والو! جب نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو تو اپنا منہ دھوؤ اور کہنیوں تک ہاتھ دھوؤ۔

دوسری جگہ فرمایا: ﴿ فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ

الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾[النحل:۹۸]

ترجمہ: پس جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کروتو اللہ کی پناہ مانگو شیطان مردود سے۔

لہذا جس طرح ان دونوں آیتوں میں قصد وارادہ محذوف ہے اسی طرح پہلی آیت کریمہ میں بھی قصدوارادہ کا معنی محذوف ہے۔

﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[الاعراف:۸]

ترجمہ: اوراس دن تول ضرور ہونی ہے توجس کے پلے بھاری ہوئے وہی مرادکو پہنچے۔

اعتراض: قیامت کے روز میزان (ترازو) توایک ہی ہوگی جس سے بندہ کے اعمال تولے جائیں گے پھراس آیت کریمہ میں لفظ موازین جمع کا صیغہ کیوں ذکرکیا گیا۔

جواب:۔لفظ''**موازین**'' یہاں موزون کی جمع ہےاوراس سے مرادوہ اعمال ہیں جن کوتولا جائے گا۔لہذا ان کے اعتبار سے جمع کا صیغہ ذکرکیا گیاہے۔

۲۔جواعمال وزن اورحساب کے لائق ہیں ان کی تین قسمیں ہیں: افعال قلوب، افعال جوارح اوراقوال، لہذا ہوسکتا ہے کہ ان تینوں کے لیے الگ الگ میزان قائم ہوں اس لحاظ سے جمع کا صیغہ لایا گیاہے۔

۳۔تمام بندوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا ان کی کثرت کے اعتبار سے میزان کوجمع لایا گیاہے۔

اعتراض: اعمال کا وزن کرنا ممکن بھی نہیں ہے اس لیے کہ یہ اعراض کے قبیل سے ہیں اور اعراض کا وزن ممکن نہیں ہے، وزن تو اجسام کا ہوتا ہے۔

جواب: ۱۔ ممکن ہے کہ اللہ رب العزت اعراض کو اجسام میں تبدیل فرمادے پھران اجسام کاوزن کیا جائے۔

۲۔نفس اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا بلکہ نیک و بد اعمال کے جو صحیفے ہوں گےان کاوزن کیا جائے گا۔

۳۔نیک اعمال حسین اجسام میں متمثل کر دیے جائیں گے اور برے اعمال قبیح اجسام میں متشکل کردیے جائیں گے۔

شعب الایمان کی حدیث پاک ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نیکیوں اور برائیوں کو جس میزان میں وزن کیا جائے گا۔اس میزان میں ایک ڈنڈی اور دو پلڑے ہیں۔رہا مومن تو اس کا عمل حسین صورت میں آئے گا اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا تو اس کی نیکیوں کا پلڑا برائیوں کے پلڑے کے بالمقابل بھاری ہوگا۔

﴿قَالَ أَنْظِرْنِی اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ﴾

[الاعراف:۱۴۔۱۵]

ترجمہ: (ابلیس) بولا مجھے فرصت دے اس دن تک کہ لوگ اٹھائے جائیں۔(اللہ نے) فرمایا: تجھے مہلت ہے۔

اعتراض: ابلیس نے تو اس لیے رب تعالیٰ سے مہلت مانگی کہ وہ

لوگوں کو گمراہ کر سکے اس اعتبار سے تو اللہ پاک کو اس کے لیے مہلت نہیں دینی چاہیے تھی تاکہ لوگ اس کی گمراہی سے بچ سکتے۔

جواب: اللہ رب العزت کے ابلیس کو مہلت دینے میں حکمت یہ ہے کہ اس میں بندوں کے لیے آزمائش ہے لہذا جب بندے آزمائش میں کامیاب ہوں گے اور اس کی مخالفت کریں گے تب ان کو ثواب زیادہ ملے گا، جس طرح اللہ پاک نے دنیا کی لذات وشہوات، اور لہو ولعب کی چیزیں بندوں کی آزمائش کے لیے پیدا فرمائیں اسی طرح ابلیس کو بھی مہلت دی ہے۔

مزید اس بات کو مثال سے یوں سمجھیں کے کہ ہمارے نزدیک عامۂ مومنین عامۂ ملائکہ سے افضل ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ علما فرماتے ہیں کہ فرشتے بہت عبادت کرتے ہیں، ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا ہے لیکن ان کے لیے عبادت کرنا اور گناہ سرزد نہ ہونا بڑی بات نہیں ہے اس لیے کہ ان کے پاس نفس ہی نہیں ہے جو گناہ پر آمادہ کرے اور ان کے پاس قوت شہوانیہ ہی نہیں کہ گناہ کے مرتکب ہوں اور رہا انسان تو اس کے پاس نفس بھی ہے اور قوت شہوانیہ بھی ہے جو گناہوں پر آمادہ کرتی ہیں اب ان سب کے ہونے کے باوجود انسان گناہوں سے اجتناب کرکے اطاعت کے لیے کمر بستہ ہے تو یہ اصل اطاعت خدا بندی ہے یہی وجہ ہے کہ عامۂ مومنین عامۂ ملائکہ سے افضل ہیں۔

﴿كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ﴾[الاعراف:۲۹]

ترجمہ: جیسے تمہارا آغاز کیا ویسے ہی پلٹو گے۔

اعتراض: اس میں انسان کے متعلق کہا: جیسے تمہارا آغاز ہوا تم ویسے

ہی پلٹو گے، انسان کا آغاز تو یوں ہوا: نطفہ کو علقہ اس کے بعد مضغہ، اس کے بعد ہڈی اور پھر اس پر گوشت چڑھایا گیا لیکن اس طرح پلٹے گا نہیں، نہ تو موت کے وقت اور نہ ہی قبر سے اٹھائے جانے کے وقت پھر آیت کریمہ میں اس تشبیہ سے کیا مراد ہے؟

جواب : ۱۔ اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہارا آغاز مٹی سے ہوا اسی طرح پھر سے مٹی ہو جاؤ گے اس کی تفسیر ایک دوسری آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔ارشاد باری ہے۔

﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ﴾ [طه: ۵۵]

ترجمہ: ہم نے زمین ہی سے تمہیں بنایا اور اسی میں تمہیں پھر لے جائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔

۲۔ یا معنی یہ ہے کہ جس طرح تمہیں بنا مال و دولت کے پیدا کیا اسی طرح جب تمہیں پلٹائیں گے تب بھی تمہارے پاس کچھ مال واسباب نہ ہوگا۔

﴿وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ [الاعراف: ۴۳]

ترجمہ: اور ندا ہوئی کہ یہ جنت تمہیں میراث ملی، صلہ تمہارے اعمال کا۔

اعتراض: میراث کہتے ہیں کہ میت کے انتقال کے بعد اس کی اولاد کو جو ترکہ ملتا ہے اور یہاں تو ترکہ، میت، انتقال، یہ سب مفقود ہیں تو جنت پر میراث کا اطلاق کیوں کر درست ہے؟

جواب : ۱۔اس آیت کریمہ میں جہنمیوں کی وراثت کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اللہ رب العزت نے جس طرح مومنین کے لیے جنت میں محلات ومقامات تیار فرمائے ہیں اسی طرح کفار ومشرکین کے لیے بھی تیار فرمائے ہیں بایں شرط کہ وہ ایمان لے آئیں لہذا جب وہ ایمان نہیں لائے تو اللہ پاک ان کے محلات و مقامات اہل جنت کو عطا فرمادے گا، یہاں میراث سے یہی مراد ہے۔

۲۔یا یہ مراد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بلاعوض مومنین کو جنت میں داخل فرمائے گا تو یہ بھی میراث کے من وجہ مشابہ ہوگئی کہ جس طرح میراث بلا کسی عوض کے ملتی ہے اسی طرح اللہ پاک جنت بھی بلاعوض اپنے فضل سے عطا فرمائے گا۔

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

[الاعراف: ۵۴]

ترجمہ: سن لو اسی کے ہاتھ میں ہے پیدا کرنا، اور حکم دینا، بڑی برکت والا ہے اللہ رب سارے جہان کا۔

اعتراض : خلق سے مراد ایجاد اور پیدا کرنا ہے یہ تو اللہ رب العزت کے ساتھ خاص ہے لیکن امر یعنی حکم دینے میں غیر بھی اس کے شریک ہیں اور لوگ بھی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکتے ہیں یا اس کے علاوہ کسی بھی چیز کا حکم دیتے ہیں، یہی تو حکم ہے۔

ارشاد باری ہے:

﴿ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾[آل عمران: ۱۰۴] کہ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں۔

جواب: یہاں امر سے مراد مطلق حکم نہیں ہے بلکہ اللہ پاک کا امر لفظ کن ہے کہ اشیا کے پیدا کرتے وقت کن فرماتا ہے تو وہ چیز وجود میں آجاتی ہیں اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

۲۔ یا آیت کریمہ میں پہلے زمین وآسمان کی پیدائش کا ذکر ہے، اور چاند وسورج اور تاروں کو اپنے حکم کے تابع کرنے کا ذکر ہے لہذا اس آیت میں امر سے یہی چاند وسورج اور تاروں کو حکم کے تابع کرنا مراد ہے اور یہ اللہ پاک کے ساتھ خاص ہے۔

﴿فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ﴾[الاعراف: ۷۹]

ترجمہ: تو صالح نے ان سے منھ پھیرا اور کہا اے میری قوم بے شک میں نے تمہیں اپنے رب کی رسالت پہنچادی اور تمہارا بھلا چاہا مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے ہو۔

اعتراض: حضرت صالح علیہ السلام کی قوم پر جب عذاب آگیا اور وہ ہلاک ہوگئی اس کے بعد آپ نے اپنی قوم کو یہ خطاب فرمایا لیکن اب خطاب کا کوئی فائدہ نہیں کہ مرنے کے بعد ان کو نصیحت یا کلام کچھ فائدہ نہ دے گا۔

جواب: ا۔ جب کوئی دوسرے کو نصیحت کرے اور وہ نصیحت پر عمل نہ کرے یہاں تک کہ مصیبت میں پھنس جائے یا قتل ہوجائے یا ہلاک ہوجائے تب ناصح کہتا ہے کہ میں نے کتنی بار تم کو نصیحت کی لیکن تم نہ مانے آخرکار ہلاک ہوگئے۔

اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب فرمایا اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ باقی لوگ نصیحت کو سن کر عمل کر لیں تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ان کی طرح ہلاک ہو جائیں۔

۲۔اور احادیث و آثار سے یہ بھی ثابت ہے کہ مردے زندوں کی آواز کو سن لیتے ہیں تب مطلب ہوگا کہ آپ نے اپنی قوم پر اتمام حجت فرمادی کہ دیکھو جس عذاب سے تمہیں ڈرایا اب وہ تم پر آ گیا۔

سورۃ الانفال

﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا﴾[الاعراف:۸۸]

ترجمہ: اس قوم کے متکبر سردار کہنے لگے: اے شعیب! ہم ضرور تمہیں اور تمہارے ساتھ والے مسلمانوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔

اعتراض: اس آیت میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے آپ سے کہا: ہم آپ کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔

عود کا معنی ہے کسی شئ کو اس کی جگہ پہنچا دینا یا دوبارہ اس کا اپنی حالت کی طرف لوٹ جانا، اب حضرت شعیب علیہ السلام تو کبھی ان کے دین پر تھے ہی نہیں پھر آپ کے لیے عود کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: حضرت شعیب علیہ السلام کے پیروکار ان کے دین میں آنے سے پہلے کافر تھے اس لیے آپ کی قوم کے کافر سرداروں نے آپ کو ان پیروکاروں میں شامل کر کے خطاب کیا تھا اسی لیے ''**اولتعودن**'' کہا۔

۲۔ کافروں نے عوام پر تلبیس اور اشتباہ ڈالنے کے لیے اس طرح کہا تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ آپ پہلے ان کے عقیدے پر ہی تھے پھر منحرف ہو گئے

اسی لیے آپ نے بھی انہیں کے وہم وگمان کے مطابق جواب دیا اور فرمایا۔

﴿قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُم بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ مِنْهَا﴾ [الاعراف: ۸۹]

ترجمہ: ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر اس کے بعد پھر تمہارے دین میں آئیں۔

۳۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے شروع شروع میں اپنے دین کو مخفی رکھا تھا اس لیے آپ کی قوم نے یہ سمجھ لیا کہ آپ ان کے دین پر تھے۔

۴۔ یہاں عود صیرورت کے معنی میں ہے تو معنی یہ ہوا تم ہمارے دین میں ہو جاؤ اب اشکال باقی نہ رہا۔

﴿وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ﴾ [الاعراف: ۱۲۰]

ترجمہ: اور جادوگر سجدے میں گرا دیئے گئے۔

اعتراض: جادوگر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر اپنی خوشی سے ایمان لائے اور اپنی خوشی سے ہی سجدہ ریز ہوئے، لیکن آیت کریمہ میں یہ کہا گیا کہ ان کو سجدے میں گرا دیا گیا اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کو زبردستی سجدہ میں گرا دیا گیا ہو؟

جواب: جادوگروں کی تعداد ستر ہزار کے قریب تھی جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھا، اللہ کے نبی کے ہاتھوں اس کی نشانیوں کو دیکھا تو تمام شبہات زائل ہو گئے اور فوراً اسکی بارگاہ بے نیاز میں سجدہ کے لیے سبقت کی اور اتنی جلدی سجدہ میں جا پہنچے گویا کہ انہیں کسی نے گرا دیا ہو

اسی لیے یہاں گرانے کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، رَبِّ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ﴾

[الاعراف: ۱۲۱۔۱۲۲]

ترجمہ: (جادوگر) کہنے لگے کہ ہم تمام جہانوں کے رب پر ایمان لائے، جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

اعتراض: قرآن پاک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مابین ہونے والے واقعہ کو بیان فرمایا، اس سورت کے علاوہ سورۂ اعراف میں سورۂ طہٰ اور سورۂ شعریٰ میں بھی اس واقعہ کو بیان کیا، لیکن اختلاف اور کمی وبیشی اور حذف واضافہ کے ساتھ تو جب واقعہ ایک ہے اور ایک ہی بار پیش آیا ہے تو پھر اختلاف کیوں ہے؟

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے درمیان واقعہ انہیں کی زبان میں پیش آیا اور قرآن پاک نے اس واقعہ کو عربی زبان میں بطور حکایت بیان کیا ہے اور حسب ضرورت کبھی مختصر بیان کر دیا، تو کبھی الفاظ کی رعایت کے ساتھ اور کبھی معنیٰ کی رعایت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور یہ تو اہل عرب کی عادت ہے کہ کلام میں حسن پیدا کرنے کی غرض سے ایک ہی بات مختلف انداز میں، اور تعبیرات بدل بدل کر پیش کرتے ہیں اور قرآن پاک افصح العرب ہے اس لیے اس میں اعلیٰ درجہ کی رعایت کیگئی۔

﴿وَوٰعَدْنَا مُوسٰى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ﴾[الاعراف: ۱۴۲]

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ فرمایا اور ان میں دس اور بڑھا کر پوری کیں۔

اعتراض: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو روزے رکھنے کا حکم دیا تھا، آپ نے تیس روزے رکھے پھر دس روزے مزید رکھنے کا حکم ہوا، اب محلِ اعتراض یہ ہے کہ روزے دن میں رکھے جاتے ہیں اس مناسبت سے یہاں "ثلثین یوما" یعنی تیس دن کا ذکر ہونا چاہیے تھا تیس راتوں کا نہیں۔

جواب: ا۔ اہلِ عرب کا یہ رواج ہے کہ وہ تاریخ وغیرہ کو رات سے شمار کرتے ہیں اگرچہ دن ہی مراد کیوں نہ ہو، اور مناسب بھی یہی ہے چونکہ رات اصل ہے اور دن عارضی ہے اس وجہ سے کہ تاریکی کا وجود روشنی سے پہلے ہے اور رات نام ہے تاریکی کا اور دن نام ہے تاریکی کے ختم ہو جانے کا۔ لہذا رات اصل ہے اسی لیے اہل عرب رات سے تاریخ شماری کرتے ہیں۔

﴿قَالَ سُبۡحَانَكَ تُبۡتُ إِلَيۡكَ وَأَنَا۠ أَوَّلُ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

ترجمہ: (موسیٰ) بولے پاکی ہے تجھے میں تیری طرف رجوع لایا، اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

اعتراض: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں فرمایا کہ میں سب سے پہلا مسلمان ہوں جبکہ آپ سے پہلے کئی انبیا تشریف لائے اور ان پر لوگ ایمان لائے وہ سب بھی تو مسلمان تھے۔

جواب: ۔ ا یہاں مطلق نہیں ہے بلکہ صرف اپنے زمانہ کے بنی اسرائیل کی طرف نسبت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ میں اپنے زمانے کے

بنی اسرائیل کا پہلا مسلمان ہوں۔

۲۔ یا مراد یہ ہے کہ میں پہلا مسلمان ہوں جس نے تیرا دیدار کیا؟ اور تجھ سے ہم کلام ہوا۔

﴿ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ﴾[الاعراف:۱۴۵]

ترجمہ: (اے موسیٰ (اپنی قوم کو حکم دے کہ اس (تورات) کی اچھی باتیں اختیار کریں۔

اعتراض: تورات اللہ پاک کا مقدس کلام ہے، اس کی تمام باتیں اچھی اور قابلِ عمل ہیں تو کیوں کہا گیا کہ اس کتاب سے اچھی باتیں اختیار کرلیں نیز اس جملہ سے یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ کیا تورات شریف میں غیر اچھی باتیں بھی ہیں۔

جواب: ا۔ یہاں بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ تورات کی اچھی باتوں کو اختیار کریں اور یہ بات بھی بدیہی طور پر معلوم ہے کہ تورات کی تمام باتیں سچی اور اچھی ہیں چونکہ یہ منزل من اللہ ہے تو گویا کہ بنی اسرائیل کو حکم ہے کہ پورے تورات پر عمل کریں کہ اس کی سبھی باتیں اچھی اور سچی ہیں۔

۲۔ اس میں حسن اور احسن دونوں طرح کی باتیں ہیں تو احسن کو اختیا کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً کسی امر میں رخصت ہو اور اس کے باوجود عزیمت پر عمل کرنا یہ احسن ہے اور یہی ان سے مطلوب ہے اور اس آیت کریمہ میں اسی جانب اشارہ ہے۔

﴿ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ﴾[الاعراف:۱۴۵]

﴿وَلَمَّا سُقِطَ فِيۡۤ اَيۡدِيۡهِمۡ وَرَاَوۡا اَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا﴾ [الأعراف : ۱۴۹]

ترجمہ: اور جب پچھتائے اور سمجھے کہ ہم بہکے بولے۔

اعتراض: یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ بچھڑے کی عبادت پر بنی اسرائیل کو ندامت ہوئی تو اس کے لیے ''سُقِطَ فِيۡۤ اَيۡدِيۡهِمۡ'' کی تعبیر کیوں لائے اور اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ا۔ ''لَمَّا سُقِطَ فِيۡۤ اَيۡدِيۡهِمۡ'' یہ ایک عربی محاورہ ہے جس کا معنی ہے: جب ان کے ہاتھوں میں ندامت گر گئی۔

سقوط کا معنی کسی چیز کا اوپر سے نیچے گرنا ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں: ''سقط المطر'' بارش گری، ''سقط الحمل'' بولتے ہیں جب بچہ نا تمام پیدا ہو جائے۔

اسی طرح جب انسان کسی عمل کا اقدام کرتا ہے پھر اس پر منکشف ہو جاتا ہے کہ عمل فاسد و باطل تھا تو گویا کہ وہ بلندی سے نیچے گر گیا اور جو عزت و بلندی حاصل تھی وہ جاتی رہی اسی طرح جب خطا ہو جائے تب یہ محاورہ بولتے ہیں کہ ''سقط فی ایدیھم'' کہ ان کے ہاتھوں میں ندامت گر گئی۔

﴿وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِم يَرهَبُونَ﴾ [الاعراف: ۱۵۴]

ترجمہ: اور جب موسیٰ کا غصہ تھم گیا تو اس نے تختیاں اٹھا لیں اور ان کے

نسخہ میں ہدایت اور رحمت ہے ان کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

اعتراض: اس آیت میں فرمایا کہ تورات کے نسخہ میں ہدایت و رحمت ہے۔ اور نسخہ کا مطلب ہے کہ کوئی چیز ایک مرتبہ لکھی پھر اس کو نقل کرا دیا تو اس نقل کو نسخہ کہتے ہیں اور تورات کا صرف ایک مکتوب تھا اس کی کوئی نقل ہی نہ تھی لہذا اس پر نسخہ کا اطلاق درست نہ ہوگا۔

جواب: تورات شریف کی دو تختیاں گرنے کے سبب ٹوٹ گئیں، ان میں ہدایت و رحمت تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سونے کی تختیوں پر لکھا، اس لحاظ سے ان پر نسخہ کا اطلاق درست ہوگا۔

۲۔ اللہ رب العزت نے تورات شریف حضرت موسیٰ کو یاد کرا دی پھر آپ کو لکھنے کا حکم دیا لہذا آپ نے اپنے سینے میں محفوظ شدہ کو تختیوں پر لکھا اسی لیے ان کو نسخہ کہا گیا ہے۔

﴿إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [الاعراف: ۱۸۸]

ترجمہ: میں تو صرف ایمان والوں کو ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔

اعتراض: اس آیت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صرف مومنین کو ڈر سنانے والے اور خوشخبری دینے والے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے وہ تو سارے لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بن کر آئے ہیں، خود قرآن پاک میں اللہ پاک فرماتا ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ [سبا: ۲۸]

ترجمہ: اور اے محبوب! ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے

خوشخبری دینے اور ڈر سنانے والا۔

جواب: بلا شبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام جن وانس کے لیے بشیر ونذیر بن کر تشریف لائے ہیں لیکن پہلی آیت کریمہ میں جو بتایا گیا ہے کہ آپ قوم مومنین کے لیے ڈر سنانے اور خوشخبری دینے کے لیے تشریف لائے یہاں مومنین کو بطور خاص ذکر کیا گیا ہے اگر چہ آپ سارے انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بن کر تشریف لائے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ آپ کے ڈرانے اور خوشخبری دینے سے مومنین ہی نفع حاصل کرتے ہیں اور انہیں کو اس کا فائدہ پہنچتا ہے تو گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کی خاطر بشیر ونذیر بن کر تشریف لائے ہیں۔اس کی تائید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے: ''ھدی للمتقین''[البقرۃ:۲] کہ قرآن پاک متقین کے لیے ہدایت ہے۔جبکہ ایسا نہیں ہے وہ تو سب کے لیے ہدایت ہے لیکن اس کی ہدایت سے مومنین اور متقین ہی فائدہ حاصل کرتے ہیں تو گویا کہ یہ متقین کے لیے ہی ہدایت ہے۔

﴿فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾[الاعراف:۱۹۰]

ترجمہ: پھر جب اس نے انہیں صحیح سالم بچہ عطا فرمایا تو انہوں نے اس کی عطا میں شریک ٹھہرالیا تو اللہ ان کے شرک سے بلند وبالا ہے۔

اعتراض: یہاں اللہ پاک نے حضرت آدم کا قصہ بیان فرمایا۔اس میں ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا نے اللہ کا شریک ٹھہرالیا حالانکہ حضرت

آدم علیہ السلام تو نبی ہیں اور انبیا تو کبائر سے بھی معصوم ہوتے ہیں ان کے بارے میں کفر وشرک کا تصور تو دور کی بات۔

جواب: ا۔اس آیت میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا سے خطاب نہیں ہے بلکہ کفار قریش سے خطاب ہے جو رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے اور قصی بن کلاب کی اولاد تھے۔

لہذا آیت کا معنی یہ ہوا: وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک نفس یعنی قصی بن کلاب سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کی بیوی بنائی جب اللہ پاک نے ان دونوں میاں بیوی کی دعا سے صالح بیٹا عطا فرمایا تو انہوں نے اللہ کی دی ہوئی نعمت میں اس کا شریک ٹھہرالیا اور انہوں نے چاروں بیٹوں کے نام یوں رکھے۔عبد مناف،عبد العزی،عبد قصی اور عبد اللات۔

۲۔ اور اگر اس سے حضرت حوا اور حضرت آدم ہی مراد لیے جائیں تو ''جعلا'' کا فاعل اولاد هما ہے اور مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔اب آیت کا معنی یہ ہوا: جب اللہ پاک نے حضرت آدم وحوا کی دعا پر ان کو صحیح وسالم بیٹا عطا فرمایا تو ان کی اولاد نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت میں اس کا شریک ٹھہرالیا۔

۳۔اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت نے مطلقاً مشرکین کے شرک کو بیان فرمایا: کہ جب میاں بیوی اللہ پاک سے دعا کرتے ہیں تو رب تعالیٰ صالح اولاد سے نوازتا ہے پھر یہ مشرکین اس کی عطا میں شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔

چناں چہ دہریہ کہتے ہیں کہ بچہ کا اس طرح پیدا ہونا فطرت کا تقاضا ہے۔ ستارے پرست کہتے ہیں کہ یہ ستاروں کی تاثیراوران کی گردش سے پیدا ہوا، بت پرست کہتے ہیں کہ یہ بتوں اور دیوتاؤوں کی عطا ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ فطرت ہو یا ستارے بت ہوں یا دیوتا ان سب کو پیدا کرنے والا بھی تو اللہ تعالی ہی ہے جس نے انسان کو پیدا فرمایا اسی نے اولاد بھی پیدا فرمائی ہے۔

❁❁❁❁❁

سورۃ الأنفال

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَ إِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾[الانفال:۲]

ترجمہ: ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کو یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جب ان پر اس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اعتراض: احناف کہتے ہیں کہ ایمان کمی زیادتی کو قبول نہیں کرتا ہے جبکہ اس آیت نے واضح طور پر بتایا ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت سے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔لہذا اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کمی بیشی کو قبول کرتا ہے۔

جواب: ہم احناف کے نزدیک ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے، اور اسلامی احکام کے اجرا کے لیے اقرار شرط ہے اور رہے اعمال تو یہ درجات میں بلندی کا سبب ہیں، لیکن اصل ایمان کمی بیشی کو قبول نہیں کرتا ہے۔ اعمال کے ذریعہ درجات بلند ہوتے رہتے ہیں اور ایمانی قوت بڑھتی جاتی ہے مثلاً: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان انبیاء کے بعد سب سے زیادہ قوی ہے۔

اور جہاں بھی آیات یا احادیث میں اس طرح ایمان کی کمی زیادتی کی بات ہو تو وہاں یا تو کمال ایمان مراد ہوگا یا پھر قوت وضعف میں کمی بیشی مراد ہوگی۔

﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَ إِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ﴾[الانفال:۵]

ترجمہ: جیسے تمہارے رب نے تمہیں تمہارے گھر سے حق کے ساتھ برآمد کیا حالانکہ یقیناً مسلمانوں کا ایک گروہ اس پر ناخوش تھا۔

اعتراض: اس آیت میں تشبیہ دی گئی لیکن اس میں مشبہ اور مشبہ بہ کہاں ہیں؟ وہ تو ذکر ہی نہیں کیے حالانکہ تشبیہ میں تو چار ارکان ہوتے ہیں۔

جواب: ا۔جی ہاں! تشبیہ میں چار ارکان ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی تشبیہ کو بلیغ بنانے کے لیے بعض ارکان کو حذف کر دیا جاتا ہے، اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں بھی ہوا ہے، اب اس آیت کا معنی یہ ہے: اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! مال غنیمت کا مسلمانوں کے اختیار سے نکال کر آپ کے اختیار میں دینا ایسے ہی حق ہے جیسے آپ کا غزوہ بدر کے لیے اپنے گھر سے نکلنا برحق تھا اگر چہ دونوں چیزیں طبعی طور پر بعض مسلمانوں کی طبیعت پر گراں گزر رہی ہیں۔

۲۔فرّا نے کہا کہ یہاں کاف واو کے معنی میں ہے، اور واو قسم کے لیے ہے، اور ما موصولہ ہے لہذا اصل عبارت یوں ہوئی: **والذی اخرجک**.

''لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿۸﴾

[الانفال:۸]

ترجمہ: تاکہ اللہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر دکھائے اگر چہ مجرم ناپسند کریں۔

اعتراض: حق کو حق کرنے اور باطل کو باطل کرنے کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو تحصیل حاصل ہے اس لیے کہ حق تو پہلے سے ہی حق ہے اسی طرح باطل بھی۔

جواب: ا۔اس آیت کریمہ میں حق سے مراد دین اسلام ہے اور باطل

سے مراد کفر وشرک ہے اب معنی ہوا: تا کہ اللہ پاک دین اسلام کو غالب اور ثابت فرمادے اور کفر وشرک کو مٹا کر نیست ونابود کردے۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ یہاں حق سے مراد قرآن ہے اور معنی یہ ہے تا کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ پاک آپ پر نازل کردہ قرآن کو ثابت اور ظاہر فرمادے۔

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَ ما رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾[الانفال:۱۷]

ترجمہ: تو تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے۔ اور اے حبیب! جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاک پھینکی تو آپ نے نہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

اعتراض: غزوہ بدر میں مومنین نے کفار قریش کے ساتھ مقابلہ کیا اور انھیں قتل کیا، اسی طرح خاک پھینکنے کے بارے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خاک پھینکی تھی اور فرمایا تھا: ''شَاهَتِ الْوُجُوْه '' کہ چہرے بگڑ جائیں۔لیکن اللہ پاک مومنین سے قتل کا اور حضور پاک سے خاک پھینکنے کا انکار فرمارہا ہے اوران سب کی نسبت اپنی طرف فرمارہا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: غزوہ بدر میں مومنین کی تعداد تقریباً ۳۱۳ اور کفار ہزاروں تھے تو بظاہر ان پر غالب آنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی ہے لیکن رب تبارک وتعالیٰ نے مدد کے لیے فرشتے بھیجے، کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ مومنین کو ثابت قدمی عطا فرمائی اس لحاظ سے اگرچہ بظاہر مومنین نے

انہیں قتل کیا لیکن درحقیقت اللہ تعالیٰ نے ہی ان کفار کو قتل کیا ہے، اسی طرح جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاک پھینکی تو اللہ پاک کے فضل خاص سے اس میں اتنا زیادہ اثر ہوا کہ سبھی کفار کی آنکھوں میں جا پہنچی اسی لیے اپنی طرف نسبت فرمائی۔

﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ أَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ﴾[الانفال: ۲۰]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور اس سے اعراض نہ کرو جب کہ تم سن رہے ہو۔

اعتراض: اس آیت میں اللہ پاک اور اس کے رسول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی اطاعت کا حکم دیا اور دونوں کی اطاعت سے اعراض کرنے سے منع فرمایا اس لحاظ سے ''وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ'' میں عنهما تثنیہ کی ضمیر ہونی چاہیے تھی جبکہ یہاں صرف واحد کی ضمیر لائی گئی ہے۔

جواب: ۱۔ اس آیت کریمہ میں واحد کی ضمیر یہ بتانے کے لیے لائی گئی کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت ایک ہی ہے اس لیے کہ دونوں کا حکم ایک ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ [النساء: ۸۰] کہ جس نے رسول کا حکم مانا اُس نے اللہ کا حکم مانا۔

اس کی نظیر یہ آیت کریمہ بھی ہے: ''قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ

وَكِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلٰمِ ''[المائدہ:۵ا۔۱۶]

ترجمہ: بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور روشن کتاب آئی، اللہ اس سے ہدایت دیتا ہے اسے جو اس کی مرضی پر چلا سلامتی کے ساتھ۔

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر ہے نور اور کتاب مبین، نور سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اس لحاظ سے یہاں بھی تثنیہ کی ضمیر ذکر کرنی چاہیے اور'' یھدی بھما '' کہنا چاہیے کہ دو چیزوں کا ذکر ہے لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کی ہدایت ایک ہی ہے اس لیے اس پر متنبہ کرنے کے لیے واحد کی ضمیر کو ہی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح اوپر کی آیت میں اسی بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت ایک ہی ہے۔

۲۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام عرب میں کبھی واحد بول کر اس سے تثنیہ اور جمع بھی مراد لے لیتے ہیں اس لیے قرآن کریم میں بھی واحد کی ضمیر ذکر کر کے اس سے تثنیہ اور جمع مراد لے لیا جاتا ہے مثلاً: قرآن پاک میں ہے:

''وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ''[التوبہ:۶۲]

ترجمہ۔ کہ اللہ اور رسول کا حق زیادہ تھا کہ اسے راضی کرتے اگر ایمان رکھتے۔ اس آیت میں اللہ و رسول کا ذکر ہوا لیکن'' ان یرضوہ ''میں واحد کی ضمیر ہے۔

﴿وَإِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ

عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾[الانفال:۳۲]

ترجمہ: اور بولے کہ اے اللہ! اگر یہی (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر تو آسمان سے پتھر برسا، یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لا۔

اعتراض: بارش آسمان سے ہی برستی ہے اس کے باوجود یہاں من السماء ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے۔؟

جواب: جی ہاں! عام طور پر بارش آسمان سے ہی نازل ہوتی ہے لیکن یہاں مطلق بارش کا ذکر نہیں ہے بلکہ پتھروں کی بارش کا ذکر ہے، کسی کو وہم ہو سکتا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ پہاڑ سے پتھروں کی بارش مراد ہو یا پھر کسی محل سے پتھروں کی بارش ہونا مراد ہو۔ یہاں اس وہم کو دور کیا، نیز اس سے عذاب میں سختی بیان کرنا مقصود ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ ﴾[الانفال:۳۳]

ترجمہ: اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک اے محبوب! تم ان میں تشریف فرما ہو۔

اعتراض: اس آیت میں یہ بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان پر عذاب نہ ہوگا اور دوسری آیت میں ہے: ''وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ ''[الانفال: ۳۴] اور انہیں کیا ہے کہ اللہ انہیں عذاب نہ کرے۔ یہ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ اللہ پاک انہیں اس حالت میں بھی عذاب دے گا تو یہ دونوں آیتوں میں تعارض ہو گیا۔

جواب: ا۔ پہلی آیت کا معنی یہ ہے کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب تک

آپ مکہ میں مقیم رہیں گے اللہ پاک ان کو عذاب نہ دے گا اور ہوا بھی ایسا کہ جب تک آپ مکہ مکرمہ میں رہے تب تک ان پر کسی طرح کا عذاب نہ آیا اور جیسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ شریف تشریف لائے، کفار کو جنگ بدر اور اس کے علاوہ دیگر جنگوں میں رسوائی اور قتل ہونے کی صورت میں عذاب دیا گیا اور یہی مطلب ہے اس آیت: ''وَمَا لَهُمۡ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ '' کا کہ حضور علیہ السلام جب مکہ سے ہجرت فرما گئے تب اللہ پاک نے ان پر عذاب اتارا۔

۲:۔ پہلی آیت میں مراد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے اللہ پاک ان کو یکبارگی عذاب نہ دے گا جس طرح پچھلی قوموں پر یکبارگی عذاب نازل ہوا اور دوسری آیت میں اس کا عکس مراد ہے۔

﴿وَإِذۡ يُرِيكُمُوهُمۡ إِذِ ٱلۡتَقَيۡتُمۡ فِيٓ أَعۡيُنِكُمۡ قَلِيلٗا وَيُقَلِّلُكُمۡ فِيٓ أَعۡيُنِهِمۡ﴾[الأنفال:44]

ترجمہ: اور جب لڑتے وقت تمہیں کافر تھوڑے کر کے دکھائے اور تمہیں ان کی نگاہوں میں تھوڑا کیا۔

اعتراض: جنگ بدر میں اللہ پاک نے کفار کو مومنین کی نظر میں تھوڑا کر دکھایا تا کہ مومنین جم کر ان کا مقابلہ کریں، اور وہ ثابت قدم رہیں، کفار کی کثرت کا رعب و دبدبہ ان کے دلوں سے نکل جائے۔

وہیں دوسری طرف کفار کی نگاہوں میں مومنین کو کم کر کے دکھایا اس میں کیا حکمت ہے؟ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ضرر میں مبتلا کرنا ہے۔

جواب: کفار کی نگاہوں میں مومنین کو اس لیے کم کر کے دکھایا تا کہ کفار بھاگ نہ جائیں، جم کر مقابلہ کریں پھر انہیں رسوائی کا سامنا کرنا پڑے لیکن یہ صورت حال ابتدا میں تھی اور جب مقابلہ ہونے لگا تب انھیں مسلمان بہت زیادہ نظر آنے لگے۔

روایت میں آیا ہے کہ ابتدا میں جب ابو جہل نے مسلمانوں کو دیکھا تو بولا کہ یہ تو اتنے کم ہیں کہ میں ان کو رسیوں میں باندھ لوں گا۔

﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾[سورة الأنفال:46]

ترجمہ: اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو کہ پھر بزدلی کرو گے اور تمہاری بندھی ہوئی ہوا جاتی رہے گی، اور صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اعتراض: یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ تنازعہ اور جھگڑا و فساد حرام ہے اسی طرح مجادلہ بھی کہ اس میں بھی نزاع پایا جاتا ہے، اس کا معنی ہے: کسی بات پر کسی سے جھگڑنا اور غالب آنے کی کوشش کرنا۔ اور یہی دونوں چیزیں مناظرہ میں بھی پائی جاتی ہیں لہذا مناظرہ کرنا بھی حرام ہونا چاہیے۔

جواب: اس آیت کریمہ میں منازعہ سے مراد جنگ کے بارے میں جھگڑنا اور اختلاف کرنا ہے۔ اور مناظرہ کا مقصد الگ ہے اس لیے دونوں میں بہت فرق ہے۔ مناظرہ سے مقصود دلائل و براہین کی روشنی میں حق کا اظہار کرنا ہے۔ مناظرہ کی تعریف یہ ہے:

توجه المتخاصمين في النسبة بين الشيئين اظهارًا للصواب. یعنی دو اختلاف کرنے والوں کا دو چیزوں کے مابین نسبت میں متوجہ ہونا اظہار صورب کی غرض سے۔

قرآن پاک میں آیا ہے: ''وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ''[النحل: ۱۲۵]

ترجمہ: اوران سے اس طریقہ پر بحث کرو جوسب سے بہتر ہو۔

فائدہ: امام رازی فرماتے ہیں کہ مناظرہ کے جواز کی جو شرطیں ہیں وہ ہمارے زمانہ میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: ایک شرط یہ ہے کہ مناظرہ کا مقصد یہ یونا چاہیے کہ فریقین میں سے کسی کی بھی زبان سے حق ظاہر ہو جائے تب فورًا اس کو سامنے والا تسلیم کرلے، یہی سلف صالحین کا مناظرہ تھا اور اس کی علامت یہ تھی کہ جب دوسرے فریق سے حق ظاہر ہو جائے تب اس سے زیادہ خوش ہوتے تھے جتنا خود سے حق ظاہر ہونے پر خوش ہوتے۔

امام رازی چھٹی صدی کے ہیں اس وقت کے بارے میں آپ یہ فرما رہے ہیں تو اب کے زمانہ کا کیا حال ہے! اب تو مقصد صرف فریق مخالف کو زیر کرنا رہتا ہے الا ماشاء اللہ۔

﴿ اَلْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾[سورة الأنفال: ٦٦]

ترجمہ: اگر تم میں سو صبر کرنے والے ہوں دو سو پر غالب آئیں گے۔ اور اگر تم میں کے ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب ہوں گے اللہ کے حکم سے۔

اعتراض: اس آیت سے ثابت ہوا کہ سو مسلمان دو سو کفار پر اور ایک ہزار مسلمان دو ہزار پر غالب آجائیں گے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ کبھی اس کا عکس بھی ہوجاتا ہے کہ سو کافر دو سو مسلمانوں پر غالب آجاتے ہیں پھر یہ ارشاد باری تعالی کس طرح درست ہوسکتا ہے؟

جواب: اللہ پاک نے اس آیت مبارکہ میں صبر کی شرط لگائی ہے کہ اگر سو مسلمان دو سو کافروں سے قتال کریں اور صبر وتوکل علی اللہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں تو ضرور دو سو پر غالب آجائیں گے بلکہ اس سے زیادہ پر بھی فتح حاصل کرلیں گے۔

کیا غور نہیں کرتے! کہ غزوہ بدر میں صرف ۳۱۳ مسلمان ہزار کافروں پر غالب آئے اور اس کے علاوہ جتنے بھی غزوات اور جنگیں ہوئی ہیں ان سب میں مسلمان کافروں سے تعداد میں کم تھے لیکن پھر بھی دشمنوں کو زیر کر کے فتح حاصل کرلی اور کلمۃ اللہ کو بلند کردکھایا۔

❁❁❁❁❁

سورۃالتوبۃ

﴿بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ﴾[التوبۃ:۱]

ترجمہ: بیزاری کا حکم سنانا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمہارا معاہدہ تھا۔

اعتراض : تمام سورتوں کے شروع میں'' بسم اللہ الرحمن الرحیم '' لکھا ہوا ہے لیکن سورہ توبہ کے شروع میں کیوں نہیں ہے؟

جواب : ا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو کاتبین وحی صحابہ کرام کو بلاتے اور اس کو جس سورت میں جس جگہ لکھنا ہوتا تھا آپ لکھوا دیتے تھے لیکن سورہ توبہ کے متعلق کچھ ارشاد نہ فرمایا۔

تب شبہ ہوا کہ آیا یہ سورہ انفال کا جز ہے اس لیے کہ سورہ انفال کی آخری آیات اور سورہ توبہ کی ابتدائی آیات کے مضامین میں مناسبت پائی جاتی ہے، یا یہ کہ مستقل سورت ہے، اس لیے صحابہ کرام نے احتیاطاً ان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے درمیان میں فاصلہ رکھا تا کہ یہ الگ سورت ہونا سمجھا جائے لیکن درمیان میں بسم اللہ شریف نہیں لکھا تا کہ سورہ انفال کا جز ہونا سمجھا جائے۔

۲۔سورہ توبہ کے شروع میں بسم اللہ شریف نازل نہیں ہوئی اس لیے اس کے شروع میں لکھی نہیں ہے،اور مسلسل تلاوت کے وقت پڑھی بھی نہیں جاتی

ہے اور یہ بھی ہے کہ اللہ پاک کے نام میں امن وسلامتی ہے،اور سورہ توبہ کی شروع آیات میں مشرکین سے جنگ وجدال کے معاملہ میں براءت کا ذکر ہے اس لیے دونوں کا اکٹھا کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اس کے شروع میں بسم اللہ شریف کو نہ لکھا۔

﴿وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ﴾[التوبة:۱۲]

ترجمہ: اور اگر عہد کر کے اپنی قسمیں توڑیں، اور تمہارے دین میں طعنہ زنی کریں تو کفر کے پیشواؤں سے قتال کرو۔

اعتراض: عہد توڑنے اور دین کے معاملہ میں طعنہ زنی میں تو سبھی کافر شامل ہیں لیکن آیت میں صرف ائمہ کفر سے قتال کو کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: ۱۔ائمہ کفر سے مراد ان کافروں کے علم بردار اور سرغنے ہیں۔ قتال میں ان کو خاص اس لیے کیا کہ مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے میں ان کا ہی ہاتھ تھا اور انہوں نے دیگر کفار کو اس امر شنیع پر آمادہ کیا تو اس نقض عہد اور دین پر طعن وتشنیع میں اصل یہ ہوئے اسی لیے ان کا ذکر بطور خاص کر دیا ہے۔

قرآن حکیم نے مسلمانوں کو ایک اصول بتا دیا کہ مخالفین کو زیر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے سرغنوں کو زیر کیا جائے باقی قوم تو خود ہی زیر ہو جائے گی آج کی دنیوی حکومتیں بھی اس اصول پر عمل کرتی ہیں کہ جب کسی قوم یا معاشرہ میں کوئی معاملہ ہو جاتا ہے ہو تو اس قوم کے سربراہ اور علم برداروں کو حکومت نظر بند

کردیتی ہے یا ان کو پکڑ لیتی ہے۔

﴿مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ﴾[التوبة:٣٦]

ترجمہ: ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہ سیدھا دین ہے تو ان مہینوں میں اپنی جان پر ظلم نہ کرو۔

اعتراض: ظلم تو کسی بھی مہینے اور کسی بھی دن نہیں کرنا چاہیے، تو ان چار مہینوں کو کیوں خاص کیا کہ ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔

جواب: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک ''فیھن'' کی ضمیر کا مرجع ''اربعة اشھر''نہیں ہے بلکہ اس سے قبل ''اثنا عشر شھرا'' یعنی بارہ مہینوں کا ذکر آیا ہے تو انہیں کی طرف ضمیر راجع ہے اور اس سے مراد یہی ہے کہ سال کے کسی بھی مہینے میں ظلم نہ کرو۔

۲۔اس سے مراد وہ حرمت والے چار مہینے ہی ہیں اور ان کو خاص ان کی عظمت ورفعت بتانے کے لیے کر دیا گیا ہے اس لیے کہ اللہ رب العزت جب ایک سبب سے کسی چیز کی عظمت بیان فرماتا ہے تو ایک سبب سے اس کی حرمت ثابت ہوتی ہے لیکن جب کثیر جہات سے عظمت و رفعت بیان فرماتا ہے تو اس کی حرمت بھی کثیر اسباب وجہات سے ثابت ہوتی ہے اسی لیے ان مقامات پر گناہ پر سزا بھی بڑھا دی جاتی ہے۔اس کی تائید اللہ پاک کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

''فَلا رَفَثَ وَلا فُسُوقَ وَلا جِدَالَ فِي الْحَجِّ''[البقرة:١٩٧]

یعنی حج میں عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ نہ ہو، کوئی گناہ اور نہ کوئی جھگڑا ہو۔

اس آیت میں دوران حج ان امور سے منع کیا گیا ہے جبکہ فسق و فجور اور جھگڑا وفساد سے ہر لمحہ منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حج ایک معظم امر ہے، اس میں بے شمار ثواب ہے، اور اس گناہ کی بھی سزا کئی گناہ زیادہ ہے اس لیے اس میں بطور خاص اس امر سے منع کیا گیا ہے اسی طرح ان چار مہینوں میں بھی بطور خاص ظلم سے منع کیا گیا ہے۔

﴿ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقَاعِدِيْنَ ﴾[التوبة:٤٦]

ترجمہ: اور ان سے کہا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔

اعتراض: اس آیت میں منافقین کو حکم دیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو یعنی جنگ میں جانے سے رکے رہو، اور جب وہ بیٹھے رہے اور جنگ سے پیچھے رہ گئے تو اس فعل پر ان کی مذمت کی گئی۔

جواب: ١۔ یہ حکم اللہ پاک کی جانب سے نہ تھا بلکہ انہیں میں سے بعض نے بعض سے کہا کہ عورتوں، بچوں اور بیماروں کے ساتھ ہو جاؤ اور جنگ میں شریک مت ہو۔

٢۔ یہ بات اللہ پاک نے ان سے بطور زجر و توبیخ فرمائی تھی جس طرح اللہ پاک نے فرمایا:

﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾[حم السجدہ:٤٠]

کہ جو جی میں آئے کرو بے شک وہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

۳۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بطور غضب فرمایا تھا لیکن انہوں نے اس ارشاد کو ظاہر پر محمول کرلیا اور جنگ میں شریک نہ ہوئے۔

﴿ قُلْ أَنفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَّن يُتَقَبَّلَ مِنكُمْ إِنَّكُمْ كُنتُمْ قَوْمًا فَاسِقِينَ ﴾[التوبہ:۵۳]

ترجمہ:اے محبوب تم فرماؤ!دل سے خرچ کرو یا ناگواری سے،تم سے ہرگز قبول نہ ہوگا،بے شک تم فاسق قوم ہو۔

اعتراض: یہ آیت بتارہی ہے کہ فاسق کی اطاعت اور اس کا صدقہ کچھ قبول نہ ہوگا جبکہ معاملہ ایسا نہیں ہے،صدقہ و اطاعت اس کا بھی بارگاہِ میں قبول ہوتا ہے۔

جواب: فسق سے یہاں کفر مراد ہے نہ کہ فسق مطلق،اس کی وضاحت آگے کی آیت کریمہ کررہی ہے،اس کے بعد اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے:

’’وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ‘‘**[التوبہ:۵۴]**

کہ وہ(منافقین)جو خرچ کرتے ہیں اس کا قبول ہونا بند نہ ہوا مگر اسی لیے کہ وہ اللہ و رسول سے منکر ہوئے۔

﴿أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴾[التوبہ:۶۹]

ترجمہ:ان(منافقین)کے اعمال اکارت ہو گئے دنیا و آخرت میں،اور وہی لوگ گھاٹے میں ہیں۔

اعتراض: اس آیت میں حبوط اعمال یعنی اعمال برباد ہونے سے مراد اگر ثواب نہ ملنا ہے تو یہ بروز قیامت ہوگا اور اگر مراد یہ ہے کہ ان کو اعمال کا نفع حاصل نہ ہوگا تو دنیا میں ایسا نہیں ہے کہ ان کے اعمال اکارت وبرباد ہوتے ہوں بلکہ وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، تب آیت میں دنیا اور آخرت میں اعمال برباد ہونے سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس آیت کریمہ میں منافقین کے دو قسم کے اعمال مراد ہیں بعض دنیا سے متعلق ہیں اور بعض آخرت سے متعلق ہیں۔ دنیا سے متعلق اعمال مثلاً منافقین کا مومنین کے ساتھ دھوکہ وفریب دہی کی کوشش کرنا، دین اسلام کی شمع کو بجھانے کے لیے منافقت کرنا، تو اللہ پاک نے ان کا یہ نفاق ظاہر فرما دیا۔ دنیا میں ہی ان کو رسوا کر دکھایا اور ان کے مکر وفریب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو آگاہ فرما دیا، دنیا میں حبوط اعمال سے یہی مراد ہے۔

اور آخرت میں ان کے اعمال کے اکارت ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ منافقین نے دنیا میں جو اطاعات وعبادت کی ہیں آخرت میں ان پر کوئی ثواب نہ ملے گا سب کو دھنوا بنا دیا جائے گا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا﴾

[الفرقان:۲۳]

ترجمہ: اور جو کچھ انہوں نے کام کیے تھے ہم نے قصد فرما کہ انھیں باریک باریک غبار کے بکھرے ہوئے ذرے کر دیا کہ روزن کی دھوپ میں نظر آتے ہیں۔

اور منافقین کے بارے میں فرمایا:

''إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا'' [النساء:۱۴۵]

کہ بے شک منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہیں۔

﴿اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾[التوبہ:۸۰]

ترجمہ: تم ان کی معافی چاہو یا نہ چاہو، اگر تم ستر بار ان کی معافی چاہو گے تو اللہ ہرگز انھیں نہیں بخشے گا۔

اعتراض: یہاں منافقین کے لیے استغفار کو ایک عدد معین یعنی ستر کے ساتھ خاص کیوں کیا۔ ان کے لیے بخشش تو کسی بھی صورت میں نہیں ہے خواہ ہزار مرتبہ استغفار کیا جائے۔

جواب: اہل عرب کی عادت ہے کہ کسی چیز کی کثرت بتانے کے لیے، اکائی یعنی ایک سے دس تک کے عدد میں سات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں اور دہائی یعنی دس سے سو تک کے عدد میں ستر کو اور ہزار تک کے عدد میں سات سو کو بطورِ مثال پیش کرتے ہیں اسی طرح اس آیت میں کثرت بتانے کے لیے سبعین (ستر) کے عدد کو ذکر کر دیا ہے، لہذا یہاں بھی کثرت بتانا مقصود ہے۔

ہم اپنی زبان میں بھی کثرت بتانے کے لیے استعمال کرتے ہیں مثلاً کوئی کسی کے گھر بار بار جائے لیکن وہ نہ ملے تو کہتا ہے یار میں آپ کے گھر دسوں مرتبہ گیا تھا لیکن آپ نہ ملے۔ یہاں بھی کثرت بھی بتانا مقصود ہوتا ہے نہ کہ عدد معین۔

اس جواب پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کو زیادہ سمجھتے ہیں وہ افصح العرب ہیں، آپ نے اس آیت سے عدد معین (ستر مرتبہ استغفار) ہی مراد لیا ہے اس کی دلیل یہ حدیث پاک ہے۔

آپ نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد فرمایا:

میں ان کے لیے ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں گا کہ شاید اللہ پاک ان کو بخش دے۔

اس کا جواب یہ ہوگا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اظہار محبت اور غلبۂ الفت کی وجہ سے فرمایا تھا اور آپ نے لوگوں کو اس طرح کی الفت و محبت پر آمادہ کیا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: '' فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ''[ابراھیم:۳۶]

ترجمہ: اور جس نے میرا ساتھ دیا وہ تو میرا ہے۔ اور جس نے میرا کہانہ مانا تو بے شک تو بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾[التوبہ:۸۰]

ترجمہ: گنوار کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور اسی قابل ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو حکم اتارے اس سے جاہل رہیں، اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔

اعتراض: جب رب تبارک و تعالیٰ نے قرآن پاک میں واضح طور پر فرما دیا کہ گنوار جاہل ہیں تو ان کے اشعار اور الفاظ سے استدلال کیوں کیا

جاتا ہے، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اشعار واقوال کو بطور حجت پیش کیا جاتا ہے۔

جواب: شعرائے عرب کے اشعار سے صرف الفاظ ومعانی میں استدلال کیا جاتا ہے اس لیے کہ وہ اہل زبان ہیں، رہے احکام شریعت تو اس میں ان کا قول حجت نہیں ہے ہم تو بس قرآن وحدیث کے الفاظ ومعانی کو سمجھنے کے لیے ان کے اشعار سے مدد لیتے ہیں کہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾
[التوبة: ۱۰۱]

ترجمہ: اور تمہارے آس پاس کے کچھ گنوار منافق ہیں اور کچھ مدینہ والے، ان کی خو ہوگئی ہے نفاق، تم انہیں نہیں جانتے ہم انھیں جانتے ہیں۔

اعتراض: اس آیت میں حضور علیہ السلام سے اللہ پاک نے فرمایا کہ تم ان منافقوں کو نہیں جانتے اور دوسری آیت میں فرمایا:

''وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ''[محمد: ۳۰] اور ضرور تم انہیں بات کے اسلوب میں پہچان لوگے۔ اب ان میں تعارض ہو گیا۔

جواب: ۱۔ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے کہ ابتدا میں ان منافقین کے بارے میں علم نہ تھا اس لیے اللہ نے فرمایا کہ اے محبوب آپ نہیں جانتے ہیں اس کے بعد علم دے دیا تب فرمایا کہ انہیں تم اسلوب کلام سے ہی پہچان لوگے۔

۲۔امام ابن جوزی نے فرمایا: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے محبوب! تم ان منافقین کے انجام کو نہیں جانتے ہو۔

﴿التَّآئِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّآئِحُونَ الرَّا كِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾

[التوبہ:۱۱۲]

ترجمہ: توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، اور برائی سے روکنے والے۔

اعتراض: اس آیت میں کئی صفات ذکر کی ہیں لیکن کسی میں ''واؤ'' کے ذریعہ عطف نہ کیا سوائے'' وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ ''کے، آخر جب کسی میں واو عطف نہیں ذکر کیا تو اس میں ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: یہ ایک امر عادی ہے کہ جب متعدد صفات جمع ہو جائیں تو بعض کو ''واؤ'' عطف کے ذریعہ ذکر کر دیتے ہیں اور بعض بنا عطف کے اس میں کوئی حکمت یا کوئی قاعدہ نہیں ہے اس کی تائید اس ارشاد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے:

﴿حٰمٓ (۱) تَنزِيلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۲) غَافِرِ الذَّنبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾ [غافر: ۱-۳]

ترجمہ: کتاب کا نازل فرمانا اللہ کی طرف سے جو عزت والا، علم والا، گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت عذاب دینے والا، بڑے انعام والا۔

لہذا اس آیت میں بھی امر عادی کے طور پر بعض میں واو کے ذریعہ عطف کر دیا اور بعض میں بنا عطف کے ذکر کر دیا ہے۔

۲۔ یہ ''واؤ''[1] ثامنہ ہے یعنی جب سات صفات ذکر کرنے کے بعد آٹھویں صفت ذکر کی جائے تو واو کے ذریعہ عطف کر دیتے ہیں اس لیے کہ اہل عرب کے نزدیک سات ہی کامل عدد ہے جس طرح اپنے یہاں دس کامل عدد ہے اور اس کی تائید قرآن پاک کی کئی آیات سے ہوتی ہے۔

مثلا سورہ کہف میں ہے:

﴿سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم﴾ (الكهف:22)

ترجمہ: اب کہیں گے کہ وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا، اور کچھ کہیں گے پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا، بغیر دیکھے اندازے ہیں، اور کچھ کہیں گے وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا۔ تم فرماؤ میرا رب ان کی تعداد خوب جانتا ہے۔

ابوعلی نے اس جواب کو تسلیم نہ کیا۔ لیکن نحوی ابوعبداللہ کفیف کا کہنا ہے کہ بعض اہل عرب کے نزدیک یہ فصیح لغت ہے کہ آٹھویں صفت کو واو کے ذریعہ عطف کر کے ذکر کرتے ہیں اس کے بعد امام قرطبی فرماتے ہیں

''قلت : هی لغة قریش'' کہ میں کہتا ہوں کہ یہ قریش کی لغت ہے۔

(تفسیر قرطبی)

❁❁❁❁❁

---

[1] ۔تبیان القرآن، علامہ غلام رسول سعیدی دیکھے۔

سورہ یونس

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ﴾[یونس:۵]

ترجمہ: وہی ہے جس نے سورج جگمگاتا بنایا اور چاند کو چمکتا بنایا، اور چاند کے لیے منزلیں مقرر کردیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان لو۔

اعتراض: اس آیت میں چاند کے لیے منزلیں مقرر کرنے سے کیا مراد ہے؟ اور اس سے کس طرح برسوں کا اور گنتی کا حساب جانا جاتا ہے؟

جواب: چاند کے لیے رب تبارک وتعالیٰ نے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں جو بارہ برجوں پر منقسم ہیں اور وہ اٹھائیس منزلیں یہ ہیں۔

سرطان، بطین، ثریا، دبران، ہقعہ، ہنعہ، ذراع نزہ طرف جبہہ، زہرہ، صرفہ، عوائ، سماک، اعزل، غفرہ، زبان، اکلیل، قلب، سوکہ، نعائم، بلدہ، سعد الذابع، سعد بلع، سعد السعود، سعد الأخبیہ، فرع المولد المقدس وفرغ الآخر، بطن الحوت۔ (تفسیر الحسنات)

چاند ہر شب ایک منزل میں رہتا ہے لہذا اگر مہینہ تیس کا ہوتا ہے تو دو شب چھپتا ہے، ورنہ ایک شب چھپتا ہے۔

اور چاند وسورج سے سالوں اور دنوں کا حساب لگایا جاتا ہے بایں طور کہ سورج کے ذریعہ دنوں کی معرفت ہوتی ہے اور چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے مہینوں اور سالوں کو شمار کیا جاتا ہے۔

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾[یونس:١٠]

ترجمہ: اور (جنت میں) ان (اہل جنت) کی آخری دعا الحمد للہ رب العالمین ہوگی۔

اعتراض: جنت میں ان کے اقوال وافعال اور دعائیں آخری نہ ہوں گی چونکہ جنت تو ہمیشگی کا گھر ہے پھر آخری کلام یا دعا کا کیا مطلب ہے؟

جواب: یہاں یہ معنی نہیں ہے کہ آخری دعا یہ ہوگی بلکہ یہ معنی ہے کہ ہر مجلس کی ابتدا اسلام سے اور ذکر وتسبیح کے بعد مجلس کا خاتمہ الحمدللہ رب العالمین کے ساتھ ہوگا۔

اس کی وضاحت اس آیت کے پہلے جزء سے ہوتی ہے چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾[یونس:١٠]

ترجمہ: جنت میں ان کی ملاقات کا پہلا بول ''سلام'' ہوگا اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہے ''ان الحمد للہ رب العالمین''

﴿قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ﴾[یونس:١٦]

ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو میں اسے نہ پڑھتا۔

اعتراض: کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے گناہ پر اللہ کی مشیت سے حجت قائم کرے، اسی لیے مشرکین کے اس فعل پر مذمت کی گئی ہے۔قرآن پاک میں ہے:

﴿سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا﴾[الأنعام:١٤٨]

ترجمہ: اب کہیں گے مشرک کہ اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا۔ رب تعالیٰ نے اس بات پر مشرکین کی مذمت فرمائی ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا: اگر اللہ چاہتا تو میں اسے نہ پڑھتا۔

جواب: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قول اللہ پاک کے حکم سے فرمایا: ﴿ قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ ﴾[یونس: ١٦] اللہ فرماتا ہے کہ اے محبوب! آپ فرمادو کہ اگر اللہ چاہتا تو میں اسے نہ پڑھتا۔

بندہ کو اگر اس طرح اللہ پاک حکم دے دے تو وہ بھی کہہ سکتا ہے ورنہ نہیں، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمانے کا من جانب اللہ حکم ملا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی اعتراض کی بات ہے۔

﴿فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾[یونس:٢٣]

ترجمہ: پھر جب اللہ انھیں بچا لیتا ہے جبھی وہ زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں۔

اعتراض: جب کوئی زیادتی یا فساد کرتا ہے خواہ زمین پر کرے یا آسمان پر وہ ناحق ہی ہوتا ہے اس کے باوجود اس آیت میں ''**بغیر حق**'' (ناحق) کی قید لگانے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: کبھی کبھی فساد حق بھی ہوا کرتا ہے کہ دشمنوں کو مرعوب

کرنے کے لیے یا کسی دوسری حکمت کے تحت ،مثلا اس فساد کے پیچھے بڑی مصلحت پنہاں ہو۔

غزوہ بنی قریظہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صحابہ کرام نے کفار کے درختوں اور فصلوں کو جلا دیا تھا یہ بھی ایک طرح کا فساد ہے لیکن یہ حق و درست ہے کہ یہاں دشمنوں کو مرعوب کرنا مقصود تھا۔

﴿قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ﴾ [یونس: ۳۱]

ترجمہ: اے محبوب فرما دو! تمھیں کون روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا ، اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے، اور کون تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ تو اب (کفار) کہیں گے: اللہ۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ رب العزت خالق و رازق ہے۔ زندگی و موت دیتا ہے، لیکن کفار تو بتوں کی عبادت کرتے ہیں وہ تو انھیں کو اپنا سب کچھ مانتے ہیں اگر وہ خدائے پاک کو اپنا خالق و رازق مانتے تو بتوں کی عبادت کیوں کرتے؟

جواب: کفار و مشرکین بتوں کی عبادت اس غرض سے کرتے تھے کہ ان کے ذریعہ سے اللہ پاک کا تقرب حاصل ہو جائے، وہ اللہ اور اپنے درمیان ان بتوں کو واسطہ مان کر ان کی عبادت کیا کرتے تھے، قرآن پاک

نے ان کے اس عقیدہ کو بیان فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہوا۔

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾[الزمر:۳]

ترجمہ:(کفار و مشرکین کہتے ہیں) ہم تو ان بتوں کی صرف اس لیے عبادت کرتے ہیں تا کہ یہ ہمیں اللہ کے زیادہ نزدیک کر دیں۔

لیکن بعض لوگوں نے اس جواب کا رد کیا ہے وہ اس طرح کہ کفار کا یہ کہنا کہ ہم بتوں کی عبادت اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ یہ ان کا جھوٹا دعویٰ ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ گے آنے والے جز میں بطور انکار جواب دیا کہ ''

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ''[یونس:الزمر:۳]

ترجمہ: بے شک اللہ ان کے درمیان اس بات میں فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾[یونس:۵۸]

ترجمہ: تم فرماؤ! اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت اور اسی پر چاہئے کہ خوشی کریں۔

اعتراض: اللہ پاک کا فضل اور اس کی رحمت، ان دو چیزوں کا ذکر ہوا تو فبذٰلك واحد کا صیغہ کیوں ذکر کیا ہے؟ بلکہ تثنیہ کا صیغہ ''فبذٰلكما ''ذکر کرنا چاہیے۔

جواب: جب اسم اشارہ کی ذلک کی طرف اضافت کی جائے تب ذلک سے واحد تثنیہ اور جمع سب کی طرف یکساں اضافت کرنا درست ہو جاتا ہے۔

اس کی تائید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾[آل عمران:14]

ترجمہ: لوگوں کے لیے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت عورتوں، اور بیٹوں، اور تلے اوپر سونے چاندی کے ڈھیر اور نشان کئے ہوئے گھوڑے اور چوپائے، اور کھیتی، یہ دنیا کی پونجی ہے۔

اس آیت کریمہ میں متعدد چیزوں کو ذکر کرنے کے بعد ''ذلك'' سے ان سب کی طرف اشارہ کر دیا گیا اسی طرح اوپر کی آیت کریمہ میں بھی ہے۔

﴿قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا﴾[یونس: ۸۹]

ترجمہ: (اللہ نے) فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول ہوئی۔

اعتراض: یہاں کہا گیا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کی دعا قبول ہوئی لیکن دعا تو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی جیسا کہ اس سے ماقبل کی آیت میں ہے کہ ﴿وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ ۖ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾[یونس: ۸۸]

ترجمہ: موسیٰ نے عرض کی: اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو آرائش اور مال دنیا کی زندگی میں دے دیا، اے ہمارے رب! تا کہ وہ تیرے راستے سے بھٹکا دیں۔ اے ہمارے رب! ان کے مال

برباد کردے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے تا کہ وہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

جواب: ۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کر رہے تھے اور حضرت ہارون آمین کہہ رہے تھے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ آمین بھی دعا ہے، اسی لیے اللہ پاک نے ان کی آمین کو بھی دعا قرار دیا اور فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوئی۔

حضرت عکرمہ سے مروی ہے آپ نے ''قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا'' کی تفسیر میں فرمایا:

قال: كان موسى يدعو و هارون يؤمن، فذلك قوله : قد اجيبت دعوتكما.

ترجمہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے اسی لیے کہا گیا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوئی۔

۲۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دعا حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں نے کی ہو لیکن اللہ رب العزت نے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر فرما دیا ہو اور ہارون علیہ السلام کی دعا کا ذکر کسی حکمت کے تحت نہ فرمایا ہو کہ وہ حاکم ہے اور حاکم کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔

اور یہ شبہ بھی بے محل ہے کہ جب دونوں حضرات نے دعا کی اور دونوں کی دعا قبول ہوئی تب '' قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا '' دعوۃ کو واحد کیوں ذکر کیا اس کو تثنیہ ذکر کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ دعوۃ مصدر ہے اور

مصدر کا اطلاق واحد تثنیہ اور جمع سب پر یکساں ہوتا ہے۔

﴿فَإِنْ كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾[یونس:۵]

ترجمہ: اے سننے والے! اگر تجھے کچھ شبہ ہو اس میں جو ہم نے تیری طرف اتارا، تو ان سے پوچھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھنے والے ہیں، بے شک تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا تو تو ہرگز شک والوں میں نہ ہو۔

اعتراض: یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا حالانکہ آپ سے شک تو متصور ہی نہیں کہ آپ پر قرآن پاک نازل ہوا اور آپ ہی اس میں شک کریں جبکہ آیت کریمہ میں یہی کہا گیا ہے اور ''إِنْ'' کا استعمال کیا ہے جو کہ احتمال کے لیے آتا ہے۔

جواب: ا۔ اس آیت کریمہ میں بظاہر خطاب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے لیکن اس سے مراد آپ کی امت ہے یا ہر وہ شخص جو یہ سن رہا ہو۔

۲۔ یا یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے اور بفرض محال آپ سے کہا گیا ہے کہ اگر بفرض محال آپ شک میں ہوں، جس طرح قرآن پاک میں آیا ہے۔

﴿قُلْ إِن كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ﴾[الزخرف: ۸۱]

ترجمہ: تم فرماؤ بفرض محال رحمٰن کے کوئی بچہ ہوتا تو سب سے پہلے میں پوجتا۔

چنانچہ تفسیری آلوسی میں اسی آیت کے تحت ہے:

والخطاب قیل:له صل الله علیه وسلم،والمراد ان کان فی ذلک علی سبیل الفرض والتقدیرلان الشک لایتصور منه علیه الصلوة والسلام لانکشاف الغطاء له.

ترجمہ: ایک قول یہ ہے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے اور مراد یہ ہے کہ اے محبوب علی سبیل الفرض اگر ایسا ہو، چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں شک تو متصور ہی نہیں ہے۔

اسی میں آگے ہے: **قیل:الخطاب له ﷺ والمراد به امته او لکل من یسمع .**

ترجمہ: ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی خطاب ہے لیکن اس سے مراد آپ کی امت یا ہر سننے والا شخص ہے۔

اور ﴿مِمَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ﴾ (یعنی جو ہم نے تم پر نازل کیا) سے کوئی اعتراض نہ کرے کہ قرآن تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تب خطاب بھی آپ سے ہے اس لیے کہ قرآن کریم میں اس کے نزول کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی گئی ہے اور لوگوں کی طرف بھی کی گئی ہے وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا لیکن لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا، اسی لیے کبھی آپ کی طرف اس کی نسبت کر دی جاتی ہے اور کبھی لوگوں کی طرف نسبت کری جاتی ہے۔

❁❁❁❁❁

سورہ ھود

﴿وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ﴾[سورہ ھود:۳]

ترجمہ: اور یہ کہ اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف توبہ کرو۔

اعتراض: توبہ پہلے ہوتی ہے اس کے بعد رب تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے استغفار کیا جاتا ہے جبکہ اس آیت میں پہلے استغفار کرنے کا حکم ہے اس کے بعد توبہ کا۔

جواب: فرّا نے کہا: ''ثم'' یہاں واو کے معنی میں ہے اور واو مطلقاً جمع کا فائدہ دیتا ہے، اس میں ترتیب کی کوئی رعایت نہیں ہوتی ہے۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور اصل عبارت یوں ہے: ''توبوا الیه ثم استغفروا ربکم'' یعنی اپنے رب کی طرف توبہ کرو پھر اس کی بارگاہ میں استغفار کرو۔

۳۔اس آیت کریمہ میں توبہ سے مراد ہے اللہ پاک کی اطاعت و بندگی کر کے عمل خیر کی طرف رجوع کرنا، اور استغفار کا معنی یہ ہے کہ جس کفر و شرک پر وہ قائم ہے اس سے استغفار کرنا، اب عمل بھی تو اسی وقت نفع بخش ہوگا جب شرک سے ایمان کی طرف لوٹے گا اسی لیے استغفار کو مقدم رکھا اور توبہ کو مؤخر رکھا ہے۔

﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي ٱلۡأَرۡضِ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ رِزۡقُهَا﴾[سورہ ھود:۶]

ترجمہ: اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کو رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ''دَآبَّۃٍ '' کو'' فی ''صلہ کے ساتھ کیوں ذکر کیا جب کہ علی صلہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا چونکہ یہی تفسیر کے زیادہ مناسب ہے کہ اس سے زمین کے اوپر چلنے والے مراد ہیں۔

جواب: ا۔مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں ''فی ،،علی کے معنی میں ہے اور اس طرح قرآن پاک میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے مثلاً:

﴿وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ﴾ [طہ:۷۱]

ترجمہ: اور تمہیں کھجور کے تنے پر ضرور سولی چڑھاؤں گا۔

اس آیت میں بھی فی ''علی '' کے معنی میں مستعمل ہے۔

۲:۔یا پھر اس آیت میں '' دَآبَّۃٍ '' کو فی صلہ کے ساتھ اس لیے ذکر کیا کہ '' في '' عام ہے، زمین پر چلنے والے کو بھی شامل ہے اور زمین کے اندر والوں کو بھی شامل ہے اسی حکمت کے تحت فی لائے ہیں کہ دونوں کو شامل ہو جائے۔

﴿فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ﴾

[سورہ ھود:۱۲]

ترجمہ: تو کیا جو وحی تمہارے طرف ہوتی ہے اس میں سے کچھ چھوڑ دو گے اور تمہارا دل اس کی وجہ سے تنگ ہو جائے گا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ضائق کا لفظ استعمال ہوا، ضیق کیوں نہیں ہوا، اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے زیادہ کشادہ دل تھے اور یہاں آپ کا تنگ دل ہونا بتایا گیا جو کہ عارض تھا کیوں کہ یہ صفت آپ کی

ذات بابرکت میں ثبوتی طور پر نہ تھی صرف عارضی تھی، جس میں بے شمار حکمتیں پنہاں تھیں، اور لفظ ضیق میں ثبوت کا معنی پایا جاتا ہے اسی لیے یہاں ضائق کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔

مثلاً جب ہم کسی کے لیے سخاوت و سیادت عارض ثابت کریں تو کہیں ''گے زید سائد'' اور جب سیادت اور جود وسخاوت کی صفت کو بطور ثبوت ثابت کریں تو کہیں گے۔زید سید وجواد۔

﴿وَ قِيۡلَ يٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِىۡ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقۡلِعِىۡ﴾ [سورہ ھود:۴۴]

ترجمہ: اور حکم فرمایا گیا کہ اے زمین! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان! تھم جا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں زمین و آسمان کو حکم دیا ہے جبکہ وہ دونوں مکلف ہی نہیں ہیں، امر و نہی کا خطاب تو اس کو ہوتا ہے جو ذی عقل و شعور ہو اور خطاب کو سمجھے لیکن زمین و آسمان میں یہ صفات نہیں پائی جاتی ہیں پھر ان کو مخاطب کیوں کیا گیا؟۔

جواب: ۱۔ یہاں بظاہر تو زمین و آسمان کو خطاب ہے لیکن درحقیقت یہ ان فرشتوں کو خطاب ہے جو زمین و آسمان پر مؤکل ہیں اور ان امور کو انجام دیتے ہیں۔

۲۔زمین و آسمان کا خطاب امر ایجادی ہے نہ کہ امر ایجابی، اب چونکہ امر ایجابی میں عقل و شعور کی حاجت درپیش ہوتی ہے مگر امر ایجادی تو تمام چیزیں خواہ ذی عقل و شعور ہوں یا نہ ہوں اللہ رب العزت کے تابع ہیں اور اس کے

مطیع وفرمابردار ہیں لہذا امر ایجادی ان کوشامل ہوجاتا ہے۔

﴿قَالُوا يٰهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ﴾ [سورہ ھود:۵۳]

ترجمہ: بولے اے ہود! تم کوئی معجزہ لے کر ہمارے پاس نہ آئے۔

اعتراض: حضرت ہود علیہ السلام رسول تھے لیکن کوئی معجزہ ظاہر نہ فرمایا اسی وجہ سے آپ کی قوم (قوم عاد) نے آپ سے کہا کہ اے ہود! تم کوئی معجزہ نہ لائے۔

پھر کس طرح سے حضرت ہود علیہ السلام کی رسالت ثابت ہوئی جب کہ رسول تو معجزہ ظاہر کرتا ہے جو اس کی نبوت ورسالت پر دلیل ہوتا ہے۔

جواب: ا۔ تفسیر بیضاوی میں ہے کہ آپ کی قوم نے یہ بات جھوٹ کہی تھی اور مذاق اڑاتے ہوئے بغض وعناد کے طور پر کہی تھی ورنہ حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو معجزے دکھائے لیکن انھوں نے منہ پھیرا اور قبول کرنے سے انکار کیا۔

۲۔ ایک قول یہ ہے کہ تیز آندھی آپ کا معجزہ تھا، اس کو آپ کے تابع کر دیا گیا تھا۔

۳۔ امام رازی فرماتے ہیں جو رسول صاحب شریعت ہو ان کے لیے معجزہ کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر شریعت میں کچھ ایسے احکام ہوتے ہیں جو لوگوں کی عقل سے ماورا ہوتے ہیں تو ان کو ثابت کرنے کے لیے رسول اپنے معجزے دکھاتے ہیں تاکہ یہ ان کی صداقت کا اعلان کریں، اور رہے وہ رسول جو صاحب شریعت نہ ہوں اور نہ ہی ماورائے عقل احکام بیان کریں تو ان کے لئے

معجزہ کی حاجت درپیش نہیں ہوتی ہے۔

﴿فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّآ أُرْسِلْتُ بِهِۦٓ إِلَيْكُمْ ۚ ﴾[سورہ ہود:۵۷]

ترجمہ: پھر اگر تم منہ پھیرو تو میں تمہیں پہنچا چکا جو تمہاری طرف لے کر بھیجا گیا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں کفار کے منہ پھیرنے کو شرط اور حضرت ہود علیہ السلام کے پیغام کو جزا قرار دیا، جب کہ حضرت ہود کا پیغام پہنچانا پہلے ہوا اور ان کا منہ پھیرنا بعد میں۔

جواب: کفار کے منہ پھیرنے کو شرط قرار دینا ٹھیک ہے لیکن بعد والے جملے کو اسکی جزا قرار دینا درست نہیں ہے، اس لیے کہ اس کی جزاء محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے "فان تولوا لم اعاتب علی تفریط فی الابلاغ" کہ اگر تم منہ پھیرو تو مجھے پیغام پہنچانے میں کوتاہی پر کسی عتاب کا سامنا نہ ہوگا پھر اس کے بعد اصل عبارت ہے کہ " فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّآ أُرْسِلْتُ بِهِۦٓ إِلَيْكُمْ " کیوں کہ میں تمہیں پہنچا چکا ہوں جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔

﴿وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ﴾ [سورہ ہود:۸۹]

ترجمہ: اور لوط کی قوم تو تم سے کوئی دور بھی نہیں ہے۔

اعتراض: لفظ قوم اگرچہ واحد ہے لیکن ایک پوری جماعت کا نام ہے اس لحاظ سے "ببعیدین" آنا چاہیے نا کہ صرف واحد " بِبَعِيدٍ " جیسا کہ قرآن پاک میں اور مقامات پر قوم کے لیے جمع کی ضمیر لائی گئی ہے مثلاً:

﴿اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَكَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ﴾[سورہ نوح: ۱]

ترجمہ: بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ ان کو ڈرائے اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب آئے۔

اس آیت کریمہ میں ''ھم''، کی ضمیر لائی گئی جو کہ جمع کے لیے ہے۔

جواب : ۱۔ اس آیت کریمہ میں مضاف محذوف ہے اور بعید اسی مضاف سے متعلق ہے۔اصل عبارت یوں ہے''وماھلاک قوم لوط منکم ببعید''لہذا اب کوئی اشکال نہ رہا۔

۲۔امام انباری کا کہنا ہے کہ بعید قوم کی صفت نہیں اسی لئے اس کو جمع نہ لائے بلکہ بعید سے پہلے لفظ مکان محذوف کی صفت ہے اور اصل عبارت یہ ہے ''وماقوم لوط منکم بمکان بعید''

۳۔ایک قول یہ ہے کہ فعیل کے صیغہ کا، واحد، تثنیہ، جمع اور اسی طرح جمع مذکر و مؤنث سب کے لئے یکساں استعمال ہے۔

قرآن پاک میں ایک جگہ ہے: ﴿وَالۡمَلٰٓئِكَةُ بَعۡدَ ذٰلِكَ ظَهِيۡرٌ﴾[سورۃ التحریم: ۴]

اس آیت میں ملائکہ جمع ہے پھر بھی ظہیر واحد اور مذکر لایا گیا ہے۔

طبراسی کے نزدیک یہ ہے کہ فعیل کا صیغہ واحد ہے لیکن جمع کا معنی دیتا ہے۔

(۱)﴿يَوۡمَ يَاۡتِ لَا تَكَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ﴾[سورہ ھود: ۱۰۵]

ترجمہ: جب وہ دن آئے گا تو کوئی شخص اللہ کے حکم کے بغیر کلام نہ کر سکے گا۔

(۲) ﴿يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَن نَّفْسِهَا﴾

[سورۃالنحل: ۱۱۱]

ترجمہ: جس دن ہر جان اپنی ہی آپ سے جھگڑتی آئے گی۔

(۳) ﴿هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ﴾

[سورۃالمرسلات: ۳۶-۳۵]

ترجمہ: یہ وہ دن ہے جس میں وہ بول نہ سکیں گے اور نہ انہیں اجازت ملے گی کہ معذرت کریں۔

اعتراض: ان تینوں آیتوں میں آپس میں تعارض ہے پہلی آیت میں ہے کہ وہ صرف اللہ پاک کی اجازت سے ہی کلام کر سکیں گے جبکہ دوسری آیت بتا رہی ہے کہ وہ اپنے آپ سے جھگڑتے ہوئے آئیں گے اور تیسری آیت تو قیامت کے پورے دن کے لئے کلام کی نفی کر رہی ہے حتی کہ معذرت کی بھی نفی کر رہی ہے۔

وہیں دوسری طرف یہ بھی ہے کہ وہ معذرت کریں گے لیکن وہ قبول نہ ہو گی لہذا اب ان میں تطبیق کس طرح ممکن ہے؟

جواب :۔ ا پہلی دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے چوں کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بنا وہ کلام نہ کر سکیں گے، لیکن جب رب تعالی ان کو کلام کرنے کی اجازت دے دے گا تو یہ خود اپنی ذات سے جھگڑنے لگیں گے، لیکن ان کا یہ جھگڑنا اللہ پاک کی طرف سے کلام کی اجازت ملنے کے بعد ہو گا۔

۲: ایک جواب یہ بھی ہے جو پہلے بھی دیا جا چکا ہے کہ قیامت کا دن کافی بڑا ہوگا اس میں مختلف مواقع ہوں گے تو بعض مقامات پر کلام کی بالکل اجازت نہ ہوگی بعض مقامات پر ان کے منہ بند کردیے جائیں گے اور ان کے اعضا ان کے اعمال کی خبر دیں گے، قرآن پاک فرماتا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓي اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾[سورہ یس:۶۵]

ترجمہ: آج ہم ان کے منہ پر مہر کریں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے کیے کی گواہی دیں گے۔

رہی تیسری آیت کریمہ تو اس سے مخصوص گروہ مراد ہوگا جسے روز قیامت شروع سے آخر تک کلام کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

﴿خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ إِلا مَا شَاءَ رَبُّكَ﴾[سورہ هود:۱۰۷]

ترجمہ: اور وہ (اہل جہنم) اس میں تب تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان رہیں مگر جتنا تمہارے رب نے چاہا۔

اعتراض: اس آیت میں بتایا کہ جہنمی جہنم میں تب تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں لیکن ایسا نہیں ہے ورنہ تو جہنم کا فنا ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ زمین و آسمان تو ایک دن فنا ہو جائیں گے رب تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾[سورہ الانفطار:۱]

ترجمہ: جب آسمان پھٹ پڑے۔

﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾[سورۃالفجر: ۲۱]

ترجمہ: ہاں ہاں! جب زمین ٹکرا کر پاش پاش کر دی جائے۔

جواب: اہل عرب کی عادت ہے کہ دوام اور ہمیشگی کے معنی کو چند الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں مثلاً۔ ''لاافعل کذا ما اختلف الیل والنهار''یعنی جب تک دن ورات بدل نہ جائیں میں یہ کام نہیں کروں گا اس جملہ میں قائل نے کام کے کبھی نہ کرنے کو رات و دن کے بدلنے سے تعبیر کیا ہے۔

اسی طرح یہ تعبیر ہے''مَادَامَتِ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ''اس سے دوام اور ہمیشگی کے معنی کو تعبیر کیا جاتا ہے لہذا یہ تعبیر ذکر کر کے آیت کا معنی یہ بتانا مقصود ہے کہ جنتی جنت میں اور جہنمی، جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

۲۔اس آیت میں کفار ومشرکین سے ان کے اعتقاد کے مطابق خطاب فرمایا ہے چونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ زمین وآسمان فنا نہیں ہوں گے وہ اسی طرح قائم رہیں گے پس قرآن پاک نے بھی ان سے ان کے اعتقاد کے مطابق کلام فرمایا۔

۳:۔یہاں زمین وآسمان سے آخرت کے زمین وآسمان مراد ہیں اور وہ ہمیشہ رہیں گے۔اور اس بات کی دلیل کہ آخرت میں زمین وآسمان دوسرے ہوں گے،قرآن پاک کی یہ آیت کریمہ ہے:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ ٱلْأَرْضُ غَيْرَ ٱلْأَرْضِ وَٱلسَّمَٰوَٰتُ﴾[سورہ ابرھیم:۴۸]

ترجمہ: جس دن بدل دی جائے گی زمین اس زمین کے سوا اور آسمان (بھی)۔

تنبیه : اب یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب دوام اور ہمیشگی سے وہ ہمیشگی مراد ہے جس کی انتہا نہیں پھر **الا ماشاءاللہ** سے استثنیٰ کرنا کیوں کر درست ہو گیا ہے؟۔

جواب : ۱۔ہاں! استثنیٰ سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد دوزخیوں کو دوزخ سے نکال دیا جائے گا اب اس کی تفصیل دیکھیں۔

۱: دوزخیوں سے مراد موحدین ہیں جن کو ان کے گناہوں کے سبب دوزخ میں ڈالا جائے گا اس کے بعد جب تک رب تبارک وتعالیٰ چاہے گا وہ اس میں رہیں پھر ان کو نکال کر جنت میں داخل فرما دے گا۔

حدیث پاک میں آیا ہے:

''حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ پاک اہل جنت کو جنت میں داخل فرمائے گا، وہ اپنی رحمت سے ہی جس کو چاہے گا جنت میں داخل فرمائے گا۔ اہل دوزخ کو دوزخ میں داخل کر دے گا پھر فرمائے گا: (اے فرشتوں) تم دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو پھر وہ دوزخ سے اس حال میں نکالے جائیں گے کہ وہ جل کر کوئلہ کی مانند ہو جائیں گے پھر ان کو حیات کے دریا میں ڈالا جائے گا تو وہ اس طرح نشو نما پائیں گے جس طرح دریا کے کنارے اگا ہوا دانہ نشو نما پاتا ہے کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ کس طرح زرد رنگ کا لپٹا ہو نکلتا ہے۔(صحیح بخاری رقم الحدیث :۶۵۶۰، ۲۲)(صحیح مسلم رقم الحدیث :۱۸۴)

۲۔ یا یہ مطلب ہے کہ جہنمی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے سوائے ان اوقات کے جب وہ دنیا میں تھے یا برزخ میں تھے یا میدان محشر میں حساب و کتاب کے لیے کھڑے ہوئے تھے لہذا اہل جہنم سے ان کے عذاب سے استثنا انھیں اوقات اور احوال کی طرف راجع ہے۔

۳۔ یہ استثنا ان کے چیخنے اور چلانے کی طرف راجع ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ جہنم میں ہمیشہ چیختے اور چلاتے رہیں گے مگر جس وقت اللہ پاک چاہے گا ان کی چیخ و پکار نہ ہوگی۔

❁❁❁❁❁

سورة الحجر

﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ﴾
[الحجر:٦]

ترجمہ: اور بولے کہ اے وہ جن پر قرآن اترا بے شک مجنون ہو۔

اعتراض: کفار نے پہلے یہ اعتراف کرلیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں تبھی تو انہوں نے کہا: اے وہ جن پر ذکر اترا۔ اور ذکر سے مراد قرآن پاک ہے، اس کے بعد یہ بھی کہا کہ بے شک تم مجنون ہو، جب نبی مان لیا تو مجنون کیوں کہا؟

جواب: کفار مکہ اس بات کو نہیں مانتے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا وہ تو ہمیشہ انکار کرتے رہے، اور اپنے اس انکار پر مصر رہے۔ یہاں انہوں نے بطور مذاق کہا تھا کہ لوگوں یہ تو کہتے تھے کہ مجھ پر قرآن اترا، وحی نازل ہوئی ہے اور ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ یہ مجنون ہیں۔

اس کی مثال قرآن پاک کی مختلف آیات میں ملتی ہے۔

فرعون نے کہا: ﴿قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ﴾ [سورة الشعراء:٢٧] بولا تمہارے یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں ضرور عقل نہیں رکھتے۔

حالانکہ فرعون نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں بلکہ اس نے یہ بات بطور استہزا کہی تھی اسی طرح اوپر کی آیت میں بھی بطور استہزا کہا گیا ہے۔

﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ

قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا ۙ إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ﴾[الحجر:57:59]

ترجمہ: پھر کیا تمہارا کیا کام ہے اے فرشتو! بولے ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، سوائے لوط کے گھر والوں کے، بے شک ہم ان سب کو بچالیں گے سوائے اس کی بیوی کے، ہم نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔

اعتراض: اس میں ہے کہ فرشتوں نے کہا کہ ہم نے مقدر کر دیا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ہلاک ہو جانے والوں میں ہوگی، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ تقدیر لکھنے میں فرشتوں کا بھی دخل ہے حالانکہ قضا اور تقدیر تو رب تبارک وتعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے، اس نے اپنے لیے اس کو خاص فرمالیا ہے، اسی نے تمام بندوں کی تقدیر لکھی ہے اور ان کے بارے میں فیصلہ فرمایا ہے۔

جواب: اس آیت کریمہ میں تقدیر کی نسبت فرشتوں کی طرف مجازاً کی گئی ہے ورنہ تو حقیقت میں اللہ تبارک وتعالی ہی کے ذمہ کرم پر یہ امر ذیشان ہے کہ بندوں کی تقدیر کا فیصلہ فرماتا۔

﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ﴾[الحجر:۸۰]

ترجمہ: اور بے شک حجر والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔

اعتراض: وادی حجر میں رہنے والی قوم ثمود تھی جن کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا گیا، ان کی طرف صرف حضرت صالح علیہ

السلام آئے اور کوئی نبی یا رسول نہ بھیجے گئے اس کے باوجود اس آیت کریمہ میں کہا گیا کہ انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا جب ایک ہی رسول آئے تو تمام رسولوں کو جھٹلانے کی بات کیوں کہی گئی؟

جواب: ا۔ ایک رسول کو جھٹلانا گویا کہ تمام رسولوں کو جھٹلانا ہے اس لیے کہ لوگوں کو توحید کی دعوت دینے میں تمام انبیائے کرام ورسلان عظام متفق ہیں اور تمام رسولوں کا پیغام ایک ہے، وہ سب اللہ کو ایک ماننے کا حکم دیتے ہیں، اس کا شریک بنانے سے منع کرتے ہیں، اس کی عبادت کا حکم دیتے ہیں تمام رسولوں کا یہی مشن ہے اس لیے اب اگر کسی نے صرف ایک رسول کی تکذیب کی تو گویا کہ تمام رسولوں کی تکذیب کی ہے۔

۲۔تمام رسولوں کی رسالت کے اثبات کا طریقہ ایک ہے کہ وہ اپنی نبوت ورسالت کو دلائل ومعجزات سے ثابت کرتے ہیں اور اپنی سابقہ پاکیزہ حیات اور صدق وامانت کو اپنی رسالت کی دلیل قرار دیتے ہیں تو جس نے ایک رسول کا انکار کیا تو گویا کہ سب کا انکار کیا اس لیے کہ سب رسولوں کی رسالت کے اثبات کا طریقہ ایک ہے۔

۳۔ یا یہ کہ ہر رسول دیگر رسولوں کی تصدیق کرنے کا حکم دیتا ہے لہذا جس نے ایک رسول کی تکذیب کی تو اس نے تمام رسولوں کی تکذیب کی۔

❁❁❁❁❁

سورۃ النحل

﴿يُنبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ﴾[سورة النحل: ۱۱]

ترجمہ: اس پانی سے وہ تمہارے لیے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل سے اگاتا ہے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں اللہ پاک نے آسمان کا وصف بیان فرمایا، اور مِن تبعیضیہ ذکر فرمایا۔ کہ ''وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ'' یعنی ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہر طرح کے پھلوں میں سے بعض کو آسمان کا پانی اگاتا ہے۔ جبکہ صرف بعض کو نہیں وہ تو سب پھلوں کو اگاتا ہے۔

جواب: ۱۔ اس میں ''مِن'' زائدہ ہے اب معنی یہ ہوا کہ ہر قسم کے پھلوں کو آسمان کا پانی لگاتا ہے۔

۲۔ یہ حقیقت ہے کہ آسمان کا پانی سبھی پھلوں کو نہیں اگاتا بلکہ بعض پھلوں کو اگاتا ہے جو دنیا میں دستیاب ہیں چونکہ تمام قسم کے پھل تو جنت میں ملیں گے، دنیا میں تو بس تقریب فہم کے لیے بعض پھلوں کو پیدا فرما دیا ہے۔

لہذا بعض پھل کہہ کر دوسرے ان پھلوں کی نفی کی گئی ہے جو دنیا میں دستیاب نہیں ہیں۔

﴿لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾[النحل: ۲۵]

ترجمہ: اس لیے کہ قیامت کے دن اپنے پورے بوجھ اور کچھ ان لوگوں کے گناہوں کے بوجھ اٹھائیں جنہیں اپنی جہالت سے گمراہ کرر ہے ہیں۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا کہ قیامت کے دن کچھ لوگ دوسرے لوگوں کے گناہوں کا بھی بوجھ اٹھائیں گے وہیں دوسری آیت کریمہ اس بات کا صاف انکار کرتی نظر آرہی ہے چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ﴾[الانعام: ۱۶۴] کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہ اٹھائے گی۔

اب دونوں آیتوں میں تعارض ہوگیا اس کو کیسے دفع کریں؟

جواب: اس آیت کریمہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ روز قیامت بعض لوگوں کے گناہ دیگر بعض کو دے دیے جائیں گے۔ بلکہ یہ معنی ہے کچھ لوگ اپنی جہالت سے لوگوں کو گمراہ کریں گے تو اس گمراہ کرنے کا گناہ ان کے سر آئے گا اور جو گمراہ ہوں گے ان کے گناہوں سے کچھ کم نہ کیا جائے گا اب دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہ رہا بلکہ یہ بات تو حدیث پاک سے ثابت ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث پاک ہے تو آقاے کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ سَنَّ فِي الإسلامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَن عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ مِن غَيرِأن يُنْقَصَ مِن أجورهم شيء،وَمَنْ سَنَّ فِي الإِسْلَامِ سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها مِنْ غَيْرِ أَن ينقص مِنْ أوزارهم شيء.

(صحیح مسلم کتاب الزکاۃ، رقم الحدیث 1017)

ترجمہ: جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا تو اسے اس کا اجر ملے گا۔اوراس کے بعد جو اس طریقے پر عمل کرے گا ان سب کے برابر اجر ملے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر میں سے بھی کچھ کم نہ کیا جائے گا،

اورجس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا تو اس کا گناہ اس پر ہوگا، اوراس کے بعد جو اس طریقہ پر عمل کرے گا اس گناہ بھی اس پر ہوگا علاوہ ازیں کہ ان کے گناہوں میں سے کچھ کم بھی نہ کیا جائے گا۔

﴿وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾[النحل:49]

ترجمہ: اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں چلنے والا ہے اور فرشتے اور وہ غرور نہیں کرتے۔

اعتراض: یہاں ''ما فی السموات وما في الأرض '' میں ما کی جگہ من ہونا زیادہ مناسب تھا کہ من ذوی العقول کے لیے آتا ہے تو مناسب تھا کہ اغلبیت کے اعتبار سے ''من'' کو ہی ذکر کیا جاتا۔

جواب: من صرف ذوی العقول کو شامل ہے تو اگر اس آیت کریمہ میں حرف ما کی جگہ من ذکر کیا جاتا تو غیر ذوی العقول خارج ہو جاتے۔

لیکن ما ذوات غیر عقول اور صفات العقول دونوں کو شامل ہے اس میں ما ذکر کرنے کا یہی فائدہ ہے کہ یہ دونوں کو شامل ہو گیا جو کہ مقصود و مطلوب تھا۔

اور قرآن پاک میں ایسی کثیر آیات ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ما ذواتِ غیر العقول اور صفات ذوی العقول کو بھی شامل ہے۔ مثلاً:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا﴾[الشمس:۷]

﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ﴾[النساء:۳]

﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى﴾ [اللیل:۳]

﴿ سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[الصف:۱]

﴿ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ﴾[الکافرون:3]

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِم مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِن دَابَّةٍ﴾[النحل:٦١]

ترجمہ: اگر اللہ لوگوں کی ان کے ظلم پر گرفت فرماتا تو زمین پر کوئی چلنے والا نہ چھوڑتا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اللہ پاک ظالموں کی ان کے ظلم کے سبب گرفت فرماتا تو روئے زمین پر چلنے والے خواہ ظالم ہوں یا غیر ظالم کسی کو بھی باقی نہ رکھتا سب کو ہلاک فرما دیتا۔لیکن یہ تو اللہ رب العزت کی شان کے خلاف ہے کہ بے قصور لوگوں کو بھی ہلاک فرمائے اور ان سے ظالموں کے سبب مواخذہ فرمائے یہ تو عدل کے خلاف ہے۔

جواب : ا۔ اس آیت میں ظلم سے مراد کفر ہے اور دابۃ سے مراد ظلم کرنے والا یعنی کافر۔اب معنی یہ ہوا کہ اگر اللہ پاک کافروں کی ان کے کفر کے سبب گرفت فرماتا تو ایک بھی کافر باقی نہ رہتا۔ یہ قول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے۔

۲۔جب لوگ کفر ومعصیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس میں حد سے بڑھ جاتے ہیں تب رب تبارک وتعالیٰ وہاں کے سب انسانوں اور سب جانوروں کو ہلاک فرما دیتا ہے، یہ ہلاکت ظالموں کے حق میں عذاب ہوتی ہے اور غیر ظالموں کے حق میں امتحان اور پھر آخرت میں ان کو اس پر ثواب ملتا ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث پاک ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب اللہ عزوجل کسی قوم کو عذاب دیتا ہے تو جو لوگ بھی اس قوم میں ہوں (خواہ نیک ہوں یا بد) ان سب کو عذاب دیتا ہے، اور آخرت میں ان کے اعمال کے حساب سے ان کا حشر کیا جائے گا۔(صحیح مسلم: رقم الحدیث: ۲۸۷۹ / صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۷۱۰۸)

۳۔ایک معنی یہ بھی بتایا ہے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ لوگوں کے کفر وضلالت اور ان کے گناہوں کے سبب ان پر گرفت فرماتا تو ان کو فوراً ہلاک فرما دیتا پھر ان کی نسل وجود میں نہ آتی، اور یہ تو ایک امر بدہی ہے کہ ہر شخص کے آبا واجداد میں ایسے لوگ ضرور گزرے ہیں جو عذاب کے مستحق تھے، لہذا اگر وہ ہلاک کر دیئے جاتے تو ان کی نسل آگے نہ چلتی پھر لازم آتا کہ دنیا میں کوئی آدمی بھی نہ ہوتا، اور پھر جانور وغیرہ بھی نہ باقی رہتے کہ یہ سب انسانوں کے فائدہ کے لیے ہی ہیں جیسا کہ اللہ پاک نے فرما ہے:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾[البقرہ: ۳] کہ جو کچھ زمین

میں ہے تمہارے فائدہ کے لیے پیدا فرمایا۔

﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾[النحل:٦٨]

ترجمہ: اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور چھتوں میں۔

اعتراض: اس مقام پر ''مِن'' کا استعمال کیوں کیا گیا حانکہ عمومی طور پر'' فی'' کا استعمال ہوتا ہے مثلاً'' **اتخذ فلان بیتاً فی الجبل**'' کہ فلاں نے پہاڑ میں ایک گھر بنایا۔

جواب: صاحب کشاف زمخشری کا کہنا ہے کہ ''مِن'' اس لیے لائے کہ بعضیت کے معنی پر دلالت کرے چونکہ ہر پہاڑ، ہر درخت اور ہر مکان میں شہد کی مکھی اپنا گھر نہیں بناتی ہے بلکہ صرف مخصوص اور محفوظ مقامات جگہ پر اپنا گھر بناتی ہے اس لیے بعضیت کے معنی بتانے کے لیے ''مِن'' کا ذکر کیا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ میرا نظریہ یہ ہے: حرف ''من'' ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ شہد کی مکھی جب گھر بناتی ہے تو لکڑیاں اور مٹی جمع کرتی ہے ان دونوں چیزوں سے تھوڑی تھوڑی مقدار جمع کرتی ہے اسی سے اپنا گھر بناتی ہے لہذا اسی بعضیت کو بیان کرنے کے لیے یہاں حرف ''مِن'' ذکر کیا گیا ہے۔

﴿وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا﴾[النحل:٧٢]

ترجمہ: اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری جانوں سے عورتیں بنائیں۔

اعتراض: عورتیں اپنے شوہروں سے نہیں ہیں ورنہ تو حرمت ثابت ہو جاتی، اور کسی صورت میں ان سے نکاح بھی حلال نہ ہوتا، پھر اس آیت میں

کیوں کہا ہے کہ عورتیں تمہاری جان سے پیدا کی گئی ہیں؟

جواب: یہاں ''انفسکم'' سے مراد جنس ہے کہ تمہاری ہی جنس سے عورتیں بھی بنائی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جنس انسان میں مرد وعورت سب شامل ہیں اس کی تائید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾[التوبة:۱۲۸]

ترجمہ: بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے۔تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے، مسلمانوں پر بہت مہربان، رحمت فرمانے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں بھی ''انفسکم'' سے جنس مراد ہے اسی طرح مذکورہ آیت میں بھی ہے۔

۲۔اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا فرمایا، لہذا اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے، نہ کہ تمام عورتوں کی طرف۔

سورہ نساء کی آیت ہے: ﴿الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾[النساء:۱]

ترجمہ: جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت پھیلا دیے۔

﴿وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ﴾

[النحل:۷۷]

ترجمہ: اور قیامت کا معاملہ نہیں ہے مگر ایک پلک کا مارنا یا اس سے بھی قریب۔

اعتراض: لفظ ''أَوْ'' شک کے لیے آتا ہے، جب کسی معاملہ میں شک ہو مثلاً: جاء زيد أو بكر.

لیکن باری تعالیٰ کے کلام میں شک محال ہے پھر یہاں حرف ''أَوْ'' کیوں ذکر کیا گیا ہے، جب کہ یہ باری تعالی کا کلام ہے۔

جواب: ''او'' کبھی بل کے معنی میں بھی آتا ہے، اور قرآن پاک میں بھی کئی مقامات پر لفظ ''او'' بل کے معنی میں مستعمل ہے اسی طرح مذکورہ آیت میں بھی اسی معنی میں ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ قیامت کا معاملہ نہیں ہے مگر ایک پلک کا مارنا بلکہ اس سے بھی قریب۔

اور جیسے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ﴾ [النجم: ۹]

ترجمہ: تو اس جلوے اور اس محبوب میں ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم۔

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ [البقرة: ۷۴]

ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔

ان دونوں آیتوں میں ''او'' بل کے معنی میں مستعمل ہے اسی طرح مذکورہ آیت میں بھی ''او'' بل کے معنی میں مستعمل ہے۔

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ﴾[النحل:81]

ترجمہ: اور اللہ نے تمہارے لیے کچھ پہناوے بنائے کہ تمہیں گرمی سے بچائیں۔

اعتراض: یہاں کہا گیا ہے کہ گرمی سے حفاظت کے لیے اللہ پاک نے لباس بنائے ہیں جبکہ اللہ پاک نے جو پہناوے بنائے ہیں وہ گرمی سے بھی بچاتے ہیں اور سردی سے بھی حفاظت کرتے ہیں لیکن یہاں صرف گرمی کا ذکر کیوں کیا گیا؟۔

جواب: جی بلاشبہ یہ پہناوے گرمی اور سردی دونوں سے حفاظت کرتے ہیں لیکن اس آیت مبارکہ میں ایک جز کو ذکر کر دیا کہ دوسری اس کی ضد ہے تو اس پر خود بخود اس کی دلالت ہو جائے گی۔جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہے"بیدک الخیر"کہ اللہ رب العزت کے دست قدرت میں ہر طرح کی بھلائی ہے۔تو یہاں صرف خیر کا ذکر کیا گیا جبکہ اس کے دست قدرت میں خیر وشر دونوں ہیں۔

اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب خیر وشر دونوں ہی اس کے دست قدرت میں ہیں اسی طرح لباس بھی گرمی اور سردی دونوں سے حفاظت کرتا ہے تو خیر اور گرمی کو ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے صرف شر اور سردی کا بھی تو ذکر ہو سکتا تھا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ خیر کا ذکر تو اس لیے کیا کہ بندوں سے خیر مطلوب ہے اور اللہ رب العزت کو محبوب ہے۔اور شر کے مقابل خیر زیادہ پائی جاتی ہے اس لیے اس کا ذکر کر دیا ہے۔رہا یہ اعتراض کہ لباس گرمی سے بچاتا ہے یہاں

گرمی کا ذکر کیوں کیا سردی کا بھی ہو سکتا تھا؟

تو اس کی وجہ یہ ہے عرب ممالک میں گرمی نہایت شدت کی ہوتی تھی اور سردی کم ہوتی تھی اس لیے ان کے لیے گرمی سے بچنے کے لیے سایہ ایک عظیم نعمت ہوتا تھا لہذا اسی کے لحاظ سے گرمی کا ذکر فرما دیا۔

﴿ قَالُوا رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ ﴾

[النحل: ٨٦]

ترجمہ: (مشرکین) کہیں گے اے ہمارے رب! یہ ہیں ہمارے شریک کہ ہم تیرے سوا پوجتے تھے۔

اعتراض: روز قیامت مشرکین کا اللہ رب العزت کے سامنے یہ بات کہنا کیا فائدہ دے گی؟ حالانکہ اللہ پاک تو جانتا ہی ہے۔

جواب: ا۔ مشرکیں پہلے اپنے شرک سے انکار کریں گے کہ اے باری تعالیٰ ہم مشرک نہ تھے" قَالُوْا وَاللّٰهِ مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ "[الانعام: ٢٣] کہیں گے اپنے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔

اس کے بعد اللہ پاک ان کی زبانیں بند کر دے گا اور جن کو یہ شریک ٹھہراتے تھے ان کے سامنے کھڑا کرے گا تو ان کے اعضا گواہی دیں گے اور کہیں گے کہ ﴿رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ ﴾[النحل: ٨٦]

کہیں گے کہ اے ہمارے رب! یہ ہیں ہمارے شریک کہ ہم تیرے سوا پوجتے تھے۔

۲۔روز قیامت مشرکین بتوں کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ اے رب! یہ ہیں ہمارے شرکا،جن کی ہم عبادت کرتے تھے۔اس سے ان کا منشا یہ ہوگا کہ وہ اپنا گناہ ان بتوں پر ڈال دیں اور انہیں عذاب الٰہی سے نجات مل جائے یا کم از کم عذاب میں تخفیف ہو جائے۔

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾[النحل: ۸۹]

ترجمہ:اور ہم نے تم پر یہ قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں ہر چیز کا روشن بیان ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی چیزوں کا ذکر قرآن پاک میں نہیں ملتا نہ صراحتاً اور نہ ہی استدلالاً مثلاً: رکعات نماز، مدت سفر،حیض،نصاب سرقہ اور حد شرب خمر وغیرہ۔

جواب: قرآن پاک میں بلا شبہ ہر چیز کا روشن بیان ہے اور اس پر ہر مومن کو ایمان بھی رکھنا چاہیے،دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:"مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ"[الانعام: ۳۸] کہ ہم نے کتاب (قرآن) میں کچھ اٹھا نہ رکھا ہے۔اس آیت کریمہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

بعض احکام قرآن مقدس سے صراحت کے ساتھ معلوم ہو جاتے ہیں،بعض بطور استدلال معلوم ہوتے ہیں اور بعض احکام کے لیے قرآن پاک نے حدیث شریف کی جانب راہ دکھائی ہے چونکہ حدیث پر عمل بھی قرآن پر عمل ہے اس لیے کہ حدیث پاک نے قرآن مجید کے احکام کو تفصیل سے بیان فرمایا۔لہذا اعتراض میں مذکورہ چیزیں بواسطہ حدیث قرآن پاک سے معلوم ہوئی ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا﴾

[الحشر:۷]

ترجمہ: اور جو تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس سے منع فرمائیں اس سے باز رہو۔

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ [النجم: ۳-۴]

ترجمہ: اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے، وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے۔

یقیناً اس مقدس کتاب میں اولین و آخرین کے تمام علوم موجود ہیں۔ ہاں! یہ ہے کہ ان کے علوم و احکام وہی نکال سکتا ہے جس پر انکشاف ہو جائے اور جس کی جتنی علمیت و ذہنیت ہے وہ اتنا ہی قرآن پاک سے استفادہ کر سکتا ہے۔

علامہ آلوسی روح المعانی میں ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مکہ شریف میں اعلان فرمایا کہ لوگو! مجھ سے جو چاہو دریافت کرو میں تمہیں قرآن پاک سے جواب دوں گا۔ تو کسی نے عرض کی: محرم کے لیے زنبور مارنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم: قال اللہ تعالی: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا﴾ [الحشر:۷]

ترجمہ: اللہ پاک نے فرمایا جو حکم ہمارا رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع فرمائے باز رہو۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔: اقتدوا بالذین من بعدی ابوبکر و عمر. کہ میرے بعد ابوبکر عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرنا۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''انہ امر بقتل المحرم الزنبور'' کہ حضرت عمر فاروق نے محرم کو زنبور مارنے کا حکم دیا۔
اب اس سے معلوم ہوا کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی قرآن کا فرمان ہے اور بالواسطہ خلفاے راشدین کا فرمان بھی فرمانِ قرآن ہے۔

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ﴾ [النحل:۹۷]

ترجمہ: جو اچھا کام کرے مرد ہو یا عورت، اور ہو مومن تو ہم ضرور اسے اچھی زندگی چلائیں گے۔

اعتراض: لفظ ''مَنْ'' مذکر و مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے اور قرآن پاک میں دیگر مقامات پر اسی طرح مستعمل بھی ہے، پھر اس آیت کریمہ میں '' مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ'' کے ذریعہ تفصیل کرنے کی کیا حاجت تھی؟

جواب: دراصل عورتوں کو شکوہ تھا کہ قرآن پاک میں جب کوئی حکم نازل ہوتا ہے تو صرف مردوں سے ہی خطاب کیا جاتا ہے عورتوں سے نہیں، اسی لیے مرد و عورت دونوں کا ذکر علاحدہ علاحدہ کر دیا۔

بعض عورتوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا شکوہ بھی کیا تھا تبھی سورۂ احزاب کی یہ آیت کریمہ بھی نازل ہوئی۔

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب:۳۵]

ترجمہ: بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور ایمان والے اور ایمان والیاں اور فرمانبردار اور فرمانبرداریں اور سچے اور سچیاں، اور صبر والے اور صبر والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور روزے والے اور روزے والیاں اور اپنی پارسائی نگاہ رکھنے والے اور نگاہ رکھنے والیاں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں ان سب کے لیے اس نے بخشش اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر فرمایا۔ اسی طرح اوپر کی آیت کریمہ میں بھی ہے۔

یا اس وجہ سے ''مِن ذکر او انثیٰ'' کی تفصیل کی کہ ''مَن عمل صالحا'' میں ایک قسم کا ابہام تھا وہ دور ہو گیا۔ یہ قول زمخشری کا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورة الإسراء

﴿سُبۡحَانَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَی﴾[سورہ بنی اسرائیل: ۱]

ترجمہ: پاکی ہے اسے جو اپنے بندوں کو راتوں رات لے گیا، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں عبد سے مراد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔مگر یہاں عبد کہہ کر آپ کو کیوں پکارا گیا ہے؟ بہتر تھا کہ نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے لیا جاتا، یا رسول، نبی کوئی صفت ذکر کر دی جاتی آخر لفظ عبد سے خطاب میں کیا حکمت تھی؟

جواب: یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول یا نبی وغیرہ سے خطاب اس لیے نہیں فرمایا کہ، رسول وہ ہے جو اللہ کی جانب سے بندوں کی طرف لوٹ کر آئے اور عبد وہ ہے جو بندوں کی طرف سے اللہ عزوجل کی طرف جائے اور یہ معراج کا موقعہ اللہ تعالی کی طرف سے آنے کا نہیں بلکہ اس کی طرف جانے کا موقعہ تھا اسی لیے لفظ عبد سے خطاب فرمایا ہے۔

۲۔اللہ رب العزت نے آپ کو ارفع و اعلیٰ مقامات پر بلا کر لفظ عبد سے خطاب فرمایا تا کہ اس امت میں کوئی ضلالت و گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائے اور آپ کے بارے میں کچھ اور عقیدہ نہ رکھنے لگے جیسا کہ نصاریٰ گمراہ ہوئے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا اور اس کا بیٹا کہنے لگے۔العیاذ باللہ۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی﴾
[سورۃالنجم:۱۰]

ترجمہ: اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی۔

اعتراض: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج ہوئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصی بھیجا پھر وہاں سے ساتوں آسمان کی بلندی سے معراج کرائی، ایسا کیوں نہ کیا کہ مسجد حرام سے سیدھا ساتویں آسمان پر بلا کر اپنے دیدار سے مشرف فرماتا آخر مسجد اقصیٰ لے جانے میں کیا حکمت تھی؟

جواب: ۱۔ بیت المقدس انبیائے کرام کی ارواح طیبات کا مرکز ہے۔ وہاں کثیر انبیائے عظام مدفون ہیں لہذا منشأ باری تعالیٰ تھا کہ ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کرادے اور مزید یہ بھی کہ آپ ان انبیا کی امامت فرمائیں تاکہ آپ کو امام ہونے کا اور دیگر انبیا و رسل کو مقتدی ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔

۲۔ مسجد اقصیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لیے بھی لے جایا گیا تاکہ آپ بیت المقدس کا مشاہدہ فرمالیں، وہاں کے مکانات، احوال وصفات کی معرفت حاصل کرلیں تاکہ جب اسرا و معراج کا واقعہ کفار مکہ کو بتائیں اور ان کو بیت مقدس کے بارے میں پوری خبر دیں اور اس کے احوال و صفات بیان فرمائیں، تاکہ کفار مکہ آپ کی تصدیق اور آپ کی بات پر یقین کرسکیں۔

﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا﴾

[سورہ بنی اسرائیل:۷]

ترجمہ: اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنا بھلا کرو گے اور اگر برا کرو گے تو اپنا۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں ''وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا'' میں لام صلہ کیوں ذکر کیا، مناسب تھا کہ اس کی جگہ ''علیٰ'' ہوتا۔ جس طرح دیگر آیات میں ہے مثلاً:

﴿مَّنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ [فصلت: ۴۶]

ترجمہ: جو نیکی کرے وہ اپنے بھلے کو، اور جو برائی کرے وہ اپنے برے کو، اور تمہارا رب بندوں پر ظالم نہیں۔

چوں کہ بھلائی اور نفع کے لیے لام صلہ آتا ہے اور برائی اور ضرر کے لیے علی صلہ آتا ہے۔

جواب: ''لام'' کبھی علی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس مقام پر بھی ''لام'' ''علیٰ'' کے معنی میں مستعمل ہے جس کی تائید قرآن پاک کی دیگر آیات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ﴾ [الصافات: ۱۰۳] ای علی الجبین۔

اور یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہمیشہ ''لام'' صلہ نفع اور بھلائی کے لیے مستعمل آتا ہو اور ''علی'' برائی اور ضرر کے لیے۔

ہاں غالباً ایسا ہوتا ہے ورنہ کئی مقامات پر خود قرآن مقدس میں دونوں ایک دوسرے کے لیے مستعمل ہیں جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

﴿وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا

فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا﴾[بنی اسرائیل:۱۶]

ترجمہ: اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں بے حکمی کرتے ہیں۔تو اس پر بات پوری ہوجاتی ہے تبھی ہم اسے تباہ کردیتے ہیں۔

اعتراض: اللہ رب العزت تو کسی کو برائی کا حکم نہیں دیتا ہے اور نہ ہی کسی کی برائی کو پسند فرماتا ہے خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ﴾[سورۃ الاعراف۲۷] کہ بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا ہے۔

لیکن اس آیت میں کیوں فرمایا جب کسی قوم کی ہلاکت کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتا ہے پھر وہ فسق وفجور کرتے پھرتے ہیں۔

جواب: ا۔اس مقام پر''امرنا'' کے بعد مفعول بہ محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے:''امرناهم بالطاعة ففسقوا ''یعنی اللہ پاک ان کو اطاعت کا حکم دیتا ہے تو وہ نافرمانی اور حکم عدولی کرتے ہیں۔

۲۔یا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو علم ازلی کے ذریعہ سب معلوم ہے کہ کون اطاعت کرے گا اور کون نافرمانی کرے گا۔اب جن کے بارے میں یہ پتہ ہے کہ یہ قوم نافرمانی کرے گی تو رب تعالیٰ اتمام حجت کے لیے انبیاو رسل کو احکام لے کر ان کی طرف بھیجتا ہے پھر وہ لوگ ان احکام کی نافرمانی کرتے ہیں،احکام کو ٹھکراتے ہیں، انبیا و رسل کی تکذیب کرتے ہیں پھر اللہ پاک ان کے کرتوتوں کے سبب عذاب بھیج کر ان کو ہلاک فرمادیتا ہے۔

﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴾[بنی اسرائیل:۲۰]

ترجمہ: ہم سب کو مدد دیتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی تمہارے رب کی عطا سے، اور تمہارے رب کی عطا پر روک نہیں۔

اعتراض: اس آیت میں عطا سے رزق مراد ہے۔ اللہ پاک کفار کو بھی روزی دیتا ہے بلکہ بظاہر لگتا ہے کہ ان کو مسلمانوں کے مقابل زیادہ دیتا ہے، لیکن بہتر یہ تھا کہ کفار کو ان کے کفر و معصیت کے سبب روزی کو روک لیتا پھر ایسا کیوں نہ کیا؟

جواب: اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کفار و مشرکین سے روزی روک لیتا تو روز قیامت ان کے لیے ایک حجت ہو جاتی کہ اے مولیٰ! اگر تو مجھے رزق دیتا اور مہلت دیتا تو ہم زیادہ عمر پاتے پھر گناہوں سے توبہ کر کے ایمان لے آتے اسی لیے اللہ پاک نے رزق نہ روکا کہ ان کو عذر کا موقع نہ ملے۔

۲۔ رزق روک لینا یہ بخیل لوگوں کے کام ہیں اور باری تعالیٰ اس سے منزہ ہے، وہ سب کو روزی دیتا ہے۔ وہ حلیم ہے عذاب میں جلدی نہیں فرماتا ہے، خود ارشاد فرماتا ہے۔

﴿فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴾[سورۃ الطارق:۱۷]

ترجمہ: کہ تم کو کافروں کو ڈھیل دو، انہیں مہلت دو۔

۳۔ روزی دینا یہ عدل ہے لہذا وہ سب کو روزی دیتا ہے خواہ ایمان لائیں یا نہ لائیں، وہ ان کو بھی روزی دیتا ہے جو اس کے وجود کے تک منکر ہیں رہی

ہدایت اور ایمان تو یہ اس کے فضل و کرم سے ہے جسے چاہے اس دولت ایمان سے نواز دے۔ انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ایمان ہے۔

﴿ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ [سورۃ الجمعۃ:۴]

ترجمہ: یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰٓ إِنَّهُۥ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا﴾ [سورہ بنی اسرائیل: ۳۲]

ترجمہ: اور بدکاری کے پاس نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی اور بہت ہی بری راہ ہے۔

اعتراض: یہاں یہ کیوں کہا گیا: ''وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰٓ'' کہ زنا کے قریب نہ جاؤ۔ بلکہ یہی کہہ دینا مناسب تھا ''وَلَا تَزْنُوا'' کہ زنا مت کرو تو اس سے زنا سے روکنے میں صراحت ہو جاتی۔

جواب: اس آیت کریمہ میں اگر ''لا تزنوا'' ہوتا تو صرف زنا سے ممانعت پر دلالت ہوتی کہ زنا مت کرو لیکن جب ''لَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰٓ'' فرمایا تو زنا اور اس کے دواعی مثلاً: لمس، معانقہ، بوسہ وغیرہ سب سے ممانعت ہو گئی۔

زنا ایک ایسا قبیح فعل ہے جس کو شریعت نے سخت ناپسند فرمایا اس لیے اس کا ارتکاب تو بڑی بات قریب جانے سے بھی منع فرمایا ہے۔

﴿وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَٰفِرْعَوْنُ مَثْبُورًا﴾ [سورہ بنی اسرائیل: ۱۰۲]

ترجمہ: (موسیٰ نے کہا) اور میرے گمان میں تو اے فرعون! ضرور ہلاک ہونے والا ہے۔

اعتراض: حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اس بات کو یقینی طور پر جانتے تھے کہ فرعون ہلاک ہوگا، پھر یہاں آپ نے گمان اور شک کے طور پر کیوں فرمایا: میرے گمان میں تو اے فرعون! ضرور ہلاک ہونے والا ہے۔

جواب: مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں ظن یقین کے معنی میں ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ''اِنِّی لَاَ ظُنُّكَ'' فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے فرعون نے آپ سے کہا تھا۔﴿اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوسٰی مَسْحُوْرًا ﴾[سورہ بنی اسرائیل: ۱۰۱] کہ اے موسیٰ! میرے خیال میں تم پر جادو ہوا ہے۔

لہذا اسی طرز پر آپ نے فرعون کا جواب دے دیا کہ اے فرعون میرے گمان میں تو ہلاک ہونے والا ہے۔

﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا ﴾[سورہ بنی اسرائیل: ۱۰۴]

ترجمہ: اور یوں کہو: سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنے لیے بچہ اختیار نہ فرمایا۔

اعتراض: حمد اس وقت کی جاتی ہے جب اللہ پاک بندہ کو کوئی نعمت عطا فرماتا ہے۔مثلا: ارشاد باری ہے:﴿وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰانَا لِهٰذَا ﴾[سورۃالاعراف:۴۳]

ترجمہ: کہیں گے سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمیں اس کی راہ دکھائی۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے بیٹا اختیار نہ فرمایا یہ کونسی نعمت ہے کہ اس پر اللہ پاک کی حمد وثنا کا حکم دیا جارہا ہے۔

جواب: جی ہاں! اللہ پاک کا بیٹا یا اولاد اختیار نہ فرمانا بھی ایک نعمت ہے کہ اس پر اس کی حمد وثنا کی جائے چونکہ جس کے اولاد ہوتی ہے وہ تمام نعمتیں اپنی اولاد کے لیے روک کر رکھتا ہے، یا کم ازکم نعمتوں کے عطا کرنے میں اپنی اولاد اور اہل وعیال کو دوسروں پر فضیلت دیتا ہے اور جس کی اولاد ہی نہیں ہوتی وہ اپنی تمام نعمتیں اپنے غلاموں اور چاہنے والوں کو دیتا ہے لہذا بالفرض اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اولاد ہوتی تو وہ اپنے خزانوں کو دوسروں سے بچا کر اپنی اولاد کو کو عطا کرتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں یہ سب صغری کبری ملا کر نتیجہ نکالنے کی اور تاویل وتشریح کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے صاف بات یہ ہے کہ اللہ پاک اولاد سے منزہ ومبرہ ہے۔

❁❁❁❁❁

سورة الکھف

﴿وَ قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ﴾[سورۃالکھف: ۲۹]

ترجمہ: اور تم فرما دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

اعتراض: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ خود مختار ہے، ایمان و کفر میں سے جو چاہے اختیار کرے، اور یہ حکم اباحت کے لیے ہے لھذا بندہ چاہے ایمان لائے یا نہ لائے۔

جواب: اس آیت کریمہ میں رب تبارک وتعالیٰ نے بندوں کو اختیار نہیں دیا کہ چاہو تو ایمان لے آؤ اور چاہو کفر کرتے رہو یہ اس نے وعید فرمائی ہے اور اپنے بندوں کو کفر سے ڈرایا ہے اسی لیے اس کے بعد فرمایا:

﴿اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِیۡنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمۡ سُرَادِقُهَا﴾[سورۃ الکھف: ۲۹]

ترجمہ: بے شک ہم نے ظالموں کے لیے وہ آگ تیار کر رکھی ہے جس کی دیواریں انہیں گھیر لیں گی۔

۲۔ رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرمایا: من شاء الله له الإيمان آمن ومن شاء الله له الكفر كفر.

(تفسیر طبری زیر آیت مذکورہ)

ترجمہ: مشیت الٰہی جس کے ایمان کی ہوئی وہ ایمان لائے گا اور جس کے کفر کی ہوئی وہ کفر کرے گا۔

۳۔ اللہ پاک اس آیت کریمہ سے اپنی بے نیازی کا اظہار فرما رہا ہے کہ اے لوگو تم ایمان لاؤ یا کفر کرو اس کا نفع و ضرر تم کو ہی لوٹے گا تم اپنے ایمان سے نہ تو اللہ کو کچھ نفع پہنچا سکتے ہو اور نہ کفر کر کے اسے کچھ ضرر پہنچا سکتے ہو۔

﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ﴾ [سورۃ الکھف: ۴۴]

ترجمہ: وہاں (قیامت میں) تمام اختیار سچے اللہ کا ہے۔

اعتراض: دنیا و آخرت دونوں میں اختیار و سلطنت سب اللہ پاک کے لیے ہی ہے پھر یہاں آخرت کے لیے خاص کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: دنیا کے اندر حکمراں اور سلاطین مجازی طور پر دعوے کرتے ہیں اور اپنے اختیارات دکھاتے پھرتے ہیں لیکن روز قیامت ان کا کوئی اختیار نہ چلے گا وہاں صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کا اختیار ہوگا اور اسی کی حکومت چلے گی۔ وہاں اللہ پاک سب کے سامنے فرمائے گا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [غافر: ۱۶]

ترجمہ: آج کس کی بادشاہت ہے؟ ایک اللہ کی جو سب پر غالب ہے۔

﴿وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا﴾ [سورۃ الکھف: ۴۹]

ترجمہ: اور کہیں گے ہائے ہماری خرابی! اس نامہ اعمال کو کیا ہوا کہ، یہ تو ہر چھوٹے بڑے گناہ کو گھیرے ہوئے ہے۔

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ روز قیامت تمام چھوٹے بڑے،صغیرہ،کبیرہ گناہ بندہ کے سامنے رکھ دیے جائیں گے۔

لیکن سورۂ نساء کی آیت کریمہ بتاتی ہے کہ جو لوگ کبائر سے اجتناب کرتے ہیں ان کے گناہ صغیرہ مٹادیے جاتے ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾[النساء: ۳۱]

ترجمہ: اگر بچتے رہو کبیرہ گناہوں سے جن کی تمہیں ممانعت ہے تو تمہارے اور گناہ (صغیرہ) ہم بخش دیں گے۔

اب دونوں آیتوں میں تعارض ہوگیا اس کو کیسے دفع کریں؟

جواب: ا۔یہ آیت کریمہ کفار کے حق میں نازل ہوئی ہے،اس کی دلیل اس سے ماقبل کی آیت ہے کہ: ”

فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا﴾[سورۃالکھف: ۴۹]

کہ تم مجروں کو دیکھو گے کہ اس کے لکھے ہوئے سے ڈریں گے اور کہیں گے کہ ہائے خرابی اس نامہ اعمال کو کیا ہوا کہ اس نے ہر چھوٹے بڑے گناہ گھیرے ہوئے ہے۔

جب کفار کے بارے میں ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے صغائر و کبائر سبھی گناہ ان کے سامنے رکھے جائیں گے اور ان پر عذاب دیا جائے گا۔

۲۔اور اگر یہ مانا جائے کہ یہ آیت مطلق ہے اور مومنین و کفار سب کو شامل ہے تب بھی تعارض نہیں ہے اس لیے کہ ممکن ہے کہ بندہ کے نوشتہ میں گناہ صغیرہ وکبیرہ دونوں لکھے جائیں اور روز قیامت اس کو دکھائے جائیں پھر ان کو مٹا دیا جائے تا کہ بندہ اللہ پاک کے عفو وکرم اور نوازشات کو جان لے کہ میرے رب کریم نے میرے اتنے زیادہ گناہ معاف فرما دیے، چونکہ انسان بہت جلدی اپنے گناہوں کو بھول جاتا ہے اور خاص کر صغیرہ گناہ تو اور بھی یاد نہیں رہتے ہیں۔

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾[الکهف: ۵۰]

ترجمہ: اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنوں میں سے تھا۔

اعتراض: یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا ''كَانَ مِنَ الْجِنِّ.

لیکن اس کا پہلا جز﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ﴾ دلالت کر رہا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا تو اب اصل معاملہ کیا ہے؟

جواب : اس مسئلہ میں مفسرین کا اختلاف ہے اور سب نے اس پر تفصیلی گفتگو بھی فرمائی ہے، لہذا تفصیلی مطالعہ کے لیے کتب تفاسیر کی طرف رجوع کریں البتہ یہاں مشہور دو قول ذکر کیے جاتے ہیں۔

ا۔ پہلا قول یہ ہے کہ ابلیس جنات سے تھا اور ارشاد باری ''كَانَ مِنَ الْجِنِّ ''اس کی دلیل ہے اور یہ حقیقی معنی میں ہے۔

اس کی سب سے قوی دلیل اللہ پاک کا یہ ارشاد بھی ہے'' ﴿أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِي﴾ [الكهف: ۵۰]

ترجمہ: تو کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو۔

اس آیت میں ابلیس اور اس کی ذریت کا ذکر ہے پس اگر ابلیس فرشتوں سے ہوتا تو اس کی ذریت ہی نہ ہوتی اس لیے کہ فرشتوں کی کوئی اولاد نہیں ہوتی ہے وہ سب نوری مخلوق ہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہاں اس کی نافرمانی کا ذکر ہے کہ اس نے رب تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور فرشتے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں وہ تو ہمہ وقت اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں کمر بستہ رہتے ہیں۔ ﴿لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ [التحريم: ٦]

ترجمہ: وہ (فرشتے) اللہ کا حکم نہیں ٹالتے، اور جو انہیں حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں۔

اور رہا آیت کریمہ کے جزء اول سے اشکال تو اس کی تاویل یہ ہے کہ وہاں عبارت محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہوگی۔

''﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ وَإِبْلِيسَ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ﴾ ''یعنی اور جب ہم نے ملائکہ اور ابلیس سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

۲۔دوسرا قول یہ ہے کہ ابلیس نافرمانی سے پہلے تو فرشتوں میں سے تھا لیکن جب اس نے نافرمانی کی تو اللہ پاک نے اس کو شیطان بنادیا۔

اس کی دلیل اللہ پاک کا یہی ارشاد ہے "**فسجدوا إلا ابلیس**" اور "**کان من الجن**" جو کہا اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں "**کان**" صار کے معنی میں ہے کہ ابلیس اس نافرمانی کے بعد جناتوں میں سے ہو گیا۔

﴿وَيَوۡمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَآءِيَ ٱلَّذِينَ زَعَمۡتُمۡ فَدَعَوۡهُمۡ فَلَمۡ يَسۡتَجِيبُوا لَهُمۡ وَجَعَلۡنَا بَيۡنَهُم مَّوۡبِقًا﴾[الکھف:۵۲]

ترجمہ: اور جس دن فرمائے گا: پکارو میرے شریکوں کو جو تم گمان کرتے تھے تو انھیں پکاریں گے وہ انہیں جواب نہ دیں گے۔ اور ہم ان کے درمیان ایک ہلاکت کا میدان کر دیں گے۔

اعتراض: یہ آیت کریمہ بتا رہی ہے کہ روز قیامت جب مشرکین بتوں کو پکاریں گے تو بت ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیں گے اور دوسری آیت کریمہ بتاتی ہے کہ یہ بت قیامت کے دن ان کی بات کا جواب دیں گے اور کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو، آیت کریمہ درج ذیل ہے۔

﴿وَ اِذَا رَاَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا شُرَکَآءَهُمۡ قَالُوۡا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَکَآؤُنَا الَّذِیۡنَ کُنَّا نَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِكَ فَاَلۡقَوۡا اِلَیۡهِمُ الۡقَوۡلَ اِنَّکُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ﴾[النحل:۸۶]

ترجمہ: اور شرک کرنے والے جب اپنے شریکوں کو دیکھیں گے کہیں گے اے ہمارے رب! یہ ہیں ہمارے شریک کہ ہم تیرے سوا پوجتے تھے، تو

(بت)ان پر بات پھینکیں گے کہ بے شک تم جھوٹے ہو۔

جواب: پہلی آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ کفار بتوں کو سفارش اور شفاعت کے لیے بلائیں گے یا اپنے اوپر ہونے والے عذاب سے بچانے کے لیے پکاریں گے تو بت ان کی بات کا جواب نہ دیں گے اور نہ کسی قسم کی کوئی مدد کرسکیں گے لہذا جو جواب کی نفی ہے اس سے مراد یہی ہے کہ شفاعت کے لیے اوران کو عذاب سے بچانے کے لیے بت کوئی جواب نہ دیں گے۔

رہی دوسری آیات کریمہ جہاں بتوں کے جواب دینے کا ذکر ہے تو وہاں مراد یہ ہے کہ کفار روز قیامت ان کی عبادت کا دعویٰ کریں گے تو بت ان کفار کے دعویٰ کی تکذیب کریں گے اور کہیں گے کہ اے باری تعالیٰ یہ کفار جھوٹے ہیں۔

فائدہ: یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ کفار تو اپنے اس قول میں سچے ہوں گے کہ ہم ان بتوں کی عبادت کرتے تھے پھر بت کیوں کہیں گے۔''انکم لکذبون'' کہ بے شک تم جھوٹے ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہے یہاں بتوں کے قول کا معنی یہ ہے کہ اے کفار! تم جو ہمیں عبادت کا مستحق سمجھ رہے ہو تم اپنے اس دعوی میں جھوٹے ہو یا عبادت کا مستحق ہونے میں ہمیں جو اللہ کا شریک ٹھہرا رہے ہو اس قول میں جھوٹے ہو۔

﴿فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا﴾[الکهف: ٦١]

ترجمہ: پھر جب وہ دونوں ان دریاؤں کے ملنے کی جگہ پہنچے دونوں اپنی مچھلی بھول گئے اوراس نے سمندر میں اپنی راہ کی سرنگ بنائی۔

اعتراض: اس واقعہ میں مچھلی بھولنے والے تو صرف حضرت یوشع بن نون تھے پھر حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع دونوں حضرات کی طرف مچھلی بھولنے کی نسبت کیوں کی گئی؟ اور اس کی دلیل کہ مچھلی بھولنے والے صرف حضرت یوشع بن نون تھے خود آگے کی آیت ہے حضرت یوشع نے عرض کی:

﴿فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَ مَاۤ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ﴾[الکھف:٦٣]

ترجمہ: تو بے شک میں مچھلی بھول گیا تھا اور مجھے شیطان ہی نے اس کا ذکر کرنا بھلایا تھا۔

جواب: ا۔ہاں! مچھلی بھولنے والے صرف حضرت یوشع بن نون ہی تھے البتہ مجازاً یہ دونوں حضرات کی طرف اس کی نسبت کردی گئی ہے۔

٢۔تفسیر بغوی میں ایک یہ جواب بھی دیا ہے کہ دونوں حضرات کی جانب بھول کی نسبت اس لیے کی کہ زادِ راہ تیار کرنے میں دونوں شریک تھے اور دونوں حضرات نے مچھلی کو اپنے سفر کے لیے رکھا تھا۔

﴿أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾[الکھف:١٠٥]

ترجمہ: یہ لوگ جنھوں نے اپنے رب کی آیتیں اور اس کا ملنا نہ مانا تو اسکا کیا دھرا سب اکارت ہے تو ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے۔

اعتراض: یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ روز قیامت کفار کے لیے

نامہ اعمال تولنے کے لیے میزان عمل قائم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے اعمال تولے جائیں گے۔

جبکہ معاملہ ایسا نہیں ہے بلکہ اعمال سب کے تولے جائیں گے سب کے لیے میزان عمل قائم ہوگی، اس کی تائید اس ارشاد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے۔

﴿وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّه هَاوِيَةٌ﴾[القارعة:۸]

ترجمہ: اور جس کے ترازو ہلکے پڑیں گے تو وہ نیچا دکھانے والی گود میں ہے۔

جواب: روز قیامت سب کے اعمال تولے جائیں گے خواہ وہ مومن ہو یا کافر اور مذکورہ آیت کریمہ میں جو کہا گیا کہ ان کے ہم اعمال نہیں تولیں گے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کے نیک اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی اور نہ ہی ان کے اعمال کا کوئی وزن ہوگا چوں کہ جب میزان عمل میں ان کے ظاہری نیک اعمال اور کفر و معصیت کا وزن ہوگا تو ظاہری نیک اعمال بے وزن ثابت ہوں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے نیک اعمال کی قدر و قیمت اور ان کے وزن کا دارو مدار ایمان ہے اور جب ان کفار کے پاس ایمان ہی نہیں تو ان کے اعمال میں وزن کہاں سے ہوگا؟ اور ان کی کیا وقعت وحیثیت ہوگی؟

اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے امام طبری نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بروز قیامت ایک خوب بڑے اور لمبے آدمی کو لایا جائے گا تو اللہ پاک کے حضور اس کا وزن ایک مچھر کے پر

کے برابر بھی نہ ہوگا، اس کے بعد آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔

﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾[الکهف:۱۰۵]

❁❁❁❁❁

سورہ مریم

﴿يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا﴾[مریم:٦]

ترجمہ: جو میرا وارث ہو اور اولاد یعقوب کا وارث ہو اور اے میرے رب اسے پسندیدہ بنا دے۔

اعتراض: انبیائے کرام اپنا وارث کسی کو نہیں بناتے ہیں جو ترکہ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہو جاتا ہے۔حدیث پاک اس پر شاہد عدل ہے۔

''نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ''(حوالہ)

ترجمہ: ہم گروہ انبیاء اپنا وارث نہیں بناتے ہیں،ہم جو ترکہ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

لیکن حضرت زکریا علیہ السلام نے کیوں اپنے لیے وارث کی دعا کی اور کہا کہ میرا اور اولاد یعقوب کا وارث بنے۔

جواب: انبیائے کرام اپنے مال کا وارث نہیں بناتے ہیں لیکن علم کا وارث بناتے ہیں''العلماء ورثة الأنبياء'' سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

زجاج کا کہنا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے رشتہ داروں میں کوئی دیندار نہ تھا اس لیے آپ کو اپنی وفات کے بعد اپنے دین کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا تبھی وارث طلب کیا جو دین و علم میں آپ کا وارث بنے اور آپ کے دین کی حفاظت کرے اور لوگوں میں اس کی تشہیر کرے۔

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّي آيَةً ۚ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾[مریم:١٠]

ترجمہ: عرض کی: اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما دے۔ فرمایا: تیری نشانی یہ ہے کہ بالکل تندرست ہوتے ہوئے بھی تین دن رات لوگوں سے کلام نہ کر سکے گا۔

اعتراض: جب اللہ پاک نے حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دے دی، کیا اب بھی ان کو اس میں شک تھا حتی کہ انہوں نے اللہ پاک سے نشانی کا مطالبہ کیا؟

جواب: آپ کو یقین تھا لیکن اطمینان قلب کے لیے نشانی کا مطالبہ کیا تاکہ شکر گزاری میں سرعت کریں اور جلد خوشی کا اظہار کریں۔

جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: اے مولیٰ تو کیسے مردوں کو زندہ فرماتا ہے تو اللہ پاک نے فرمایا کیا تجھے یقین نہیں؟ آپ نے عرض کی! کیوں نہیں؟ مگر میں چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آجائے اور دل مطمئن ہو جائے۔

ارشاد باری ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ﴾[البقرہ:۲۶۰]

﴿قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا (۱۸) قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا﴾[مریم:۱۸-۱۹]

ترجمہ: مریم بولی! میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھے خدا کا ڈر ہے، (فرشتے نے کہا) میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ میں تجھے ایک پاکیزہ بیٹا عطا کروں۔

اعتراض: مذکورہ آیت کریمہ اور سورۂ آل عمران کی آیات جن میں حضرت مریم اور حضرت جبرئیل کے مابین کلام ہوا، ان سب سے حضرت مریم کی نبوت کا ثبوت ہوتا ہے۔

اسی لیے ایک جماعت ان کی نبوت کی قائل ہے امام قرطبی نے اس مسئلہ کو اپنی تفسیر میں ذکر لیا ہے اور آپ نے بھی ان کے نبیہ ہونے کے قول کو ترجیح دی ہے۔

جواب: جمہور کا موقف یہ ہے کہ کوئی بھی عورت نبی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ پاک کا واضح ارشاد ہے۔

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ ﴾[النحل:۴۳]

ترجمہ: اور ہم نے تم سے پہلے مرد ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

یہ آیت کریمہ صاف دلالت کررہی ہے کہ جتنے بھی رسول آئے ہیں سب مرد تھے انہی کو وحی ہوتی تھی۔

حضرت مریم رضی اللہ عنھا کے نبیہ ہونے پر یہ دلیل دینا کہ آپ کے لیے لفظ وحی استعمال ہوا ہے، اور آپ کی طرف وحی آئی ہے، تو یہ استدلال کافی نہیں ہے چونکہ قرآن پاک میں لفظ وحی الہام کے لیے بھی آیا ہے جس طرح چیونٹی اور شہد کی مکھی کی طرف الہام فرمانے کا ذکر ہے، اور اس کے علاوہ کئی معنوں میں لفظ وحی کا استعمال ہوا ہے، لہذا یہ لفظ نبوت و رسالت ثابت کرنے کے لیے یہ لفظ کافی نہیں ہے۔

مذکورہ آیت میں وحی سے مراد وحی رسالت نہیں ہے جو انبیائے کرام کی طرف کی جاتی ہے بلکہ یہ وحی بشارت ہے کہ اللہ پاک نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔

اور سورۂ آل عمران کی آیت کریمہ ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ﴾[آل عمران: ۴۲]

ترجمہ: بے شک اللہ نے تجھے چن لیا اور خوب ستھرا کیا اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا۔

یہاں لفظ "اصطفیٰ" سے بھی حضرت مریم کی نبوت پر استدلال کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ یہاں چننے سے مراد یہ ہے کہ آپ کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے چن لیا باوجود اس کے کہ آپ ایک عورت تھیں، اور آپ کو جہان کی تمام عورتوں سے اختیار فرمایا اور ان پر فضیلت دی۔

﴿لَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا﴾[مریم: ۲۰]

ترجمہ: (مریم نے کہا) مجھے کسی آدمی نے ہاتھ نہ لگایا اور نہ میں بدکارہ ہوں۔

اعتراض: مذکورہ آیت کریمہ میں حضرت مریم نے "لم اک بغیا" فرمایا جبکہ مونث کے لیے "بغیة" مونث کا صیغہ استعمال ہوتا ہے لہذا یہاں آپ کو "بغیة" کہنا چاہیے تھا۔

جواب: امام انباری کا کہنا ہے کہ فحش اور بدکاری کا وصف اکثر و بیشتر

عورتوں میں پایا جاتا ہے اور مردوں میں بہت کم پایا جاتا ہے۔اسی لیے اہل عرب ''رجل بغی'' بہت کم استعمال کرتے ہیں لہذا مذکورہ آیت میں حائض اور عاقر کے قائم مقام رکھ کر بغیا کہا گیا ہے کہ جس طرح وہ الفاظ عورتوں کے ساتھ خاص ہیں اسی طرح یہ لفظ بغی بھی ہے۔امام زہری نے فرمایا کہ ''رجل بغی'' استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ مونث کے ساتھ خاص ہے۔

ابن عاشور نے''التحریر و التنویر''میں اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

لفظ بغیا زانیہ عورت کے ساتھ خاص ہے اسی لیے اس کے آخر میں تائے تانیث نہیں آتی ہے،

مزید یہ کہ:''بغی'' فعیل یا فعول کے وزن پر اسم فاعل کے معنی میں ہے اس کی اصل حرکات بغوی تھی تعلیل کے بعد''بغی''بن گیا ہے۔

اور فعیل اور فعول کا صیغہ واحد،تثنیہ اور جمع اسی طرح تذکیر و تانیث سب کے لیے یکساں مستعمل ہے۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ ماقبل کی آیتوں کے وزن کی رعایت کرتے ہوئے ''بغیا'' آیا ہے،کہ اس سے ماقبل کی آیات میں ''شرقیا ، سویا، تقیا، زکیا'' آیا ہے۔

﴿ قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيٓ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ بِي حَفِيًّا﴾[مریم:۴۷]

ترجمہ:(ابراہیم نے)اپنے والد سے فرمایا:بس تجھے سلام ہے۔عنقریب میں تیرے لیے اپنے رب سے استغفار کروں گا،بے شک وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔

اعتراض : ا۔ کسی کافر کے لیے استغفار کرنا جائز نہیں ہے، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لیے استغفار کا کیوں وعدہ فرمایا حالانکہ وہ کافر تھے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کفار کو سلام کرنا بھی جائز نہیں ہے لیکن آپ نے اپنے والد کو سلام کیا:

جواب اول: ا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے جو استغفار کا وعدہ فرمایا تھا، وہ ایمان کی شرط سے مشروط ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتے تو ضرور ان کے لیے استغفار کرتے، لہذا جب وہ ایمان نہ لائے تو آپ ان سے بیزا ہو گئے اور دعا نہ کی، اس بات کو بھی قرآن پاک نے واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ﴾[التوبة:۱۱۴]

ترجمہ: اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے استغفار کرنا تو وہ نہ تھا مگر ایک وعدہ کے سبب جو اس سے کر چکا تھا پھر جب ابراہیم کو کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے تنکا توڑ دیا (لاتعلق ہو گیا)

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کے معنی یہ ہے کہ میں اللہ سے تمہارے ایمان و ہدایت کی دعا کروں گا تاکہ پھر تمہاری مغفرت ہو سکے اور اس طرح کفار کے لیے بھی دعا کرنا جائز و درست ہے۔

جواب دوم: اور یہ اعتراض کرنا کہ آپ نے ان کو سلام کیوں کیا تو اس

کا جواب یہ ہے کہ سلام کی دو قسمیں ہیں سلام تحیت اور سلام متارکہ یہ تعظیم و محبت کا سلام نہ تھا بلکہ یہ متارکہ کا سلام تھا۔اور سلام متارکہ کہتے ہیں: کسی کو چھوڑنے اور اس سے قطع تعلق کرنے کے لیے سلام کرنا،اور یہ سلام کفار کو کرنا بھی جائز و درست ہے۔لہذا آپ نے یہی سلام متارکہ کیا تھا۔

قرآن پاک کی آیت سے بھی تائید ہو رہی ہے چناں چہ ارشاد باری تعالی ہے۔

﴿وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ﴾[القصص:٥٥]

ترجمہ: اور جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں، بس تمہیں سلام ہو ہم جاہلوں سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔

اور اللہ پاک نے اپنے نیک بندوں کی صفات میں اس کو شامل فرمایا کہ وہ جاہلوں سے سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں ان کے منہ نہیں لگتے ہیں۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾[الفرقان:٦٣]

ترجمہ: اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی اور عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں،اور جب جاہل ان سے بحث کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں بس تمہیں سلام ہو۔

❁❁❁❁❁

سورہ طه

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ﴾[طه:١٧]

ترجمہ: اور یہ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ اے موسیٰ!

اعتراض: اللہ رب العزت کے اس سوال کرنے میں کیا حکمت ہے؟ جبکہ وہ تو سب جانتا ہے اس بارے میں۔

جواب: اس سوال میں حکمت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا کو اچھے سے دیکھ لیں، اور قلب میں یہ بات خوب راسخ ہو جائے کہ یہ عصا ہے تا کہ جس وقت سانپ کی شکل اختیار کرے تو آپ کی خاطر مبارک پر کوئی پریشانی کا اثر نہ ہو۔

یا یہ حکمت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانوس کیا جائے تا کہ ہیبت مکالمت کا اثر کم ہو جائے۔[مدارک التنزیل]

﴿قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ﴾[طه:١٨]

ترجمہ: عرض کی: یہ میرا عصا ہے میں اس پر تکیہ لگاتا ہوں۔ اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں، اور میرے اس میں اور کام ہیں۔

اعتراض: حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال تو صرف یہ ہوا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ لیکن آپ نے جواب میں سوال کے علاوہ مزید اتنی باتوں کا اضافہ کیوں کیا؟، یہ تو بلغاء کے کلام کے خلاف ہے اور خصوصاً

جب اللہ رب العزت سے کلام ہو۔

جواب : حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کے فوائد کا تذکرہ کیا اور اس کی ضرورت کے بارے میں بتایا کہ وہ اس سے کیا کیا کام انجام دیتے ہیں اور وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے کوہِ طور پر ملاقات کے وقت نعلین اتارنے کا حکم ملا تھا تو اب کہیں عصا کو جدا کرنے کا حکم نہ دے دیا جائے ،اسی لیے آپ نے عرض کی کہ عصا سے آپ یہ سب کام انجام دیتے ہیں

﴿اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ ۚ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی﴾

[طه:١٢]

ترجمہ: بے شک میں تیرا رب ہوں پس تو اپنے جوتے اتار ڈال، بے شک تو پاک جنگل طویٰ میں ہے۔

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک کے سوال کرنے پر کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کی میرا عصا ہے، اس کے بعد پھر سوال ہوا کہ اس سے کیا کرتے ہو تب آپ نے جواب میں باقی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ گویا کہ سوال ثانی محذوف ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گفتگو کو طول دیا اس غرض سے کہ اللہ پاک کے جلووں کا دیدار دیر تک کر سکیں، اور اس کی جانب اپنی توجہ دیر تک کر سکیں تا کہ زیادہ سے زیادہ شرف دیدار سے مشرف ہو سکیں۔

اس بارے میں حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ملتا ہے جس کو ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

سرکار اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ''**المعتمد المستند**'' میں نسیم الریاض کے حوالہ سے ذکر فرمایا ہے کہ عارف باللہ سیدنا ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں مسجد اقصی کے حرم کے بیچ و بیچ لیٹا ہوا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ فوج درفوج بہت سی مخلوق داخل ہوئی، میں نے کہا یہ کیسی جماعت ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ انبیا ورسل صلوات اللہ علیہم کی جماعت ہے۔ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حضرت حسین بن منصور حلاج کی شفاعت کے لیے حاضر ہوئے ہیں جوں کہ ان سے ایک خلافِ ادب امر واقع ہو گیا تھا۔

امام شاذلی فرماتے ہیں کہ میں نے تخت کی طرف دیکھا تو کیا دیکھتا یوں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تنہا تشریف فرما ہیں اور دیگر انبیاء مثلاً حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم، وغیرہ زمین پر تشریف فرماں ہیں، اب میں کھڑے ہو کر ان کی طرف دیکھتا تھا اور ان کا کلام سنتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر کہا: آپ نے فرمایا: ''**علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل**'': میری امت کے علما بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں، تو مجھے ان عالموں میں سے کوئی دکھائیے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام غزالی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میری امت کے علما میں ایک یہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کوئی سوال کیا تو آپ نے اس کے دس جواب دیئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان پر یہ فرماتے ہوئے معترض ہوئے کہ سوال جواب کے مطابق ہونا چاہیئے۔ سوال ایک ہے اور جواب دس۔ اب امام غزالی نے عرض کی کہ آپ سے جب سوال

ہوا کہ اے موسیٰ! تمہارے داہینے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ یہ میری لاٹھی ہے پھر آپ نے اس کی بہت صفات بیان فرمائیں۔

امام شاذلی نے فرمایا: اس دوران میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان اور تخت پر آپ کے تنہا تشریف فرمانے کے بارے میں سوچ رہا تھا حالانکہ باقی انبیا زمین پر تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے مجھے اپنے پیر سے ایسی ٹھوکر ماری کہ میں گھبرا کر اٹھ گیا، اور دیکھا کر مسجد اقصی کا نگہبان قندلیں جلا رہا ہے، تو اس نے کہا کہ تم تعجب نہ کرو یہ سب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے پیدا کیے گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا پھر جب نماز قائم ہوئی مجھے ہوش آیا تو میں نے اس نگہبان کو تلاش کیا لیکن اب تک اسے نہ پایا۔

﴿فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ﴾ [طه: ۲۰]

ترجمہ: تو موسیٰ علیہ السلام نے (عصا) ڈال دیا جبھی وہ دوڑتا ہوا سانپ ہو گیا۔

اعتراض: اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کو کبھی حیۃ فرمایا اور کبھی ثعبان اور کبھی جان تو اس میں کیا حکمت ہے؟ جبکہ جان اور ثعبان میں فرق ہے جان چھوٹے سانپ کو کہتے ہیں اور ثعبان بڑے سانپ کو کہتے ہیں جبکہ عصا ایک ہی تھا تو ایک عصا چھوٹا اور بڑا کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے سانپ بننے کی مختلف حالتیں تھیں۔ ابتدا میں وہ چھوٹے سانپ نظر آتا تھا اس کے بعد وہ بڑا ہو جاتا

تھا اس اعتبار سے کوئی تعارض نہیں ہے چونکہ جہاں جان فرمایا وہ پہلی حالت کا اعتبار ہے اور جہاں ثعبان فرمایا وہاں دوسری حالت کا اعتبار ہے۔

۲۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اپنے جسم کے اعتبار سے اژدھا اور بڑا سانپ تھا لیکن حرکت کے اعتبار سے مثل جان تھا اسی لیے دونوں کا الگ الگ اعتبار کرتے ہوئے کہیں جان فرمایا اور کہیں ثعبان ذکر فرمایا۔

﴿اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ [طه:۷۴]

ترجمہ: بے شک جو اپنے رب کے حضور مجرم ہو کر آئے تو ضرور اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ مرے گا اور نہ جئے گا۔

اعتراض: انسان کے لیے دو ہی صفت ہیں یا وہ مردہ ہوگا یا زندہ دونوں صفات کا نہ تو ایک ساتھ اجتماع ہوسکتا ہے اور نہ ہی ارتفاع ہوسکتا ہے پھر مذکورہ آیت کریمہ میں کیوں کہہ دیا کہ جہنم میں جہنمی نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔

جواب: اس آیت میں دونوں صفات کا ارتفاع مقصود نہیں ہے یہاں شدت بتانا مقصود ہے کہ کافر نہ تو جہنم میں مریں گے کہ مر کر اس عذاب سے چھوٹ سکیں اور نہ ہی اس میں ایسا جینا جی پائیں گے کہ کچھ نفع اٹھا سکیں۔

﴿وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ [طه:۱۲۱]

ترجمہ: حضرت آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی تو جو مقصد چاہا وہ نہ پایا۔

اعتراض: قرآن نے جس طور پر حضرت آدم علیہ السلام کے لیے عصی اور غوی کا لفظ استعمال کیا ہے تو کیا اس لحاظ سے حضرت آدم علیہ

السلام کو عاصی اور غاوی کہا جاسکتا ہے؟

جواب: قرآن پاک کی تعبیر کے لحاظ سے ''**عصی آدم**'' تو کہہ سکتے ہیں لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی نہیں کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ لازم نہیں ہے کہ فعل پر کسی چیز کا اطلاق جائز ہو تو اس کے اسم فاعل پر بھی اس کا اطلاق جائز ہو۔

مثلاً قرآن پاک میں ہے ''**وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا**'' [البقرہ: ۳۱] کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ پاک نے تمام نام سکھا دیے، اس آیت میں سکھانے کی نسبت اللہ پاک کی طرف کی گئی ہے۔ لیکن اللہ پاک کو معلم نہیں کہہ سکتے ہیں۔

مزید تفصیل کے لیے تفسیر بیضاوی کا مطالعہ کریں۔

اسی طرح تبارک اللہ کہنا جائز ہے لیکن اللہ تبارک جائز نہیں ہے ''تاب اللہ علی آدم'' کہنا جائز ہے لیکن اللہ تائب جائز نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا﴾

[طہ: ۱۲۴]

ترجمہ: اور جس نے میرے ذکر سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ زندگی ہے۔

اعتراض: اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ جو ذکر الٰہی سے اعراض کرے تو وہ تنگ زندگی گزارے گا جبکہ ہم کفار و مشرکین کو دیکھتے ہیں کہ وہ سب اللہ تعالی کے ذکر سے اعراض کرتے ہیں بلکہ اس کو ہی نہیں مانتے ہیں لیکن پھر بھی خوشحال نظر آتے ہیں اور مومنین کے بالمقابل زیادہ خوشحال، اور عیش و عشرت

کی زندگی گزارتے ہیں۔

جواب: ۱۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''معیشة ضنکا'' سے مراد گناہوں بھری زندگی ہے لہذا اگرچہ وہ کفار و مشرکین بظاہر عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی گناہوں سے لت پت ہوتی ہے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ جو اللہ رب العزت کے ذکر سے اعراض کریں گے وہ دنیا اور اس کے مال و متاع پر بہت حریص ہوں گے۔ اور بلا شبہ جو شخص کافر ہوتا ہے وہ دنیا کے جمع کرنے پر بہت حریص ہوتا ہے اور ہمہ وقت دنیا کے مال میں زیادتی کا طالب رہتا ہے، چونکہ اس کی نظر صرف دنیا پر ہوتی ہے۔ آخرت پر نہیں تو ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ مال و دولت کہیں ضائع نہ ہو جائے۔

۳۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ قبر یا قیامت کے دن جہنم کی تنگی مراد ہے۔

❁❁❁❁❁

سورة الأنبياء

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ﴾

[الانبیاء: ۱]

ترجمہ: لوگوں کے لیے ان کا حساب قریب آ گیا اور وہ غفلت میں منھ پھیرے ہوئے ہیں۔

اعتراض: یہ بات چودہ سو برس پہلے کہی گئی کہ لوگوں کا حساب قریب ہے اور اس سے مراد قیامت ہے، اور ابھی تک وقت حساب نہ آیا لہذا اس کو قریب سے تعبیر کرنا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟

جواب: ۱۔اس آیت کا معنی ہے کہ گزشتہ زمانہ کی بنسبت قیامت بہت قریب ہے۔

حدیث پاک میں آیا ہے:

مثل الدنیا کمثل ثوب شق من أوله إلی آخره فبقي متعلقا بخیط في آخره فیوشك ذلك الخیط أن ینقطع

(إتحاف السادة المتقین بشرح إحیاء علوم الدین، کتاب ذکر الموت وما بعده، الفصل الرابع.

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا کی مثال ایسے کپڑے کی طرح ہے جو شروع سے آخر تک پھٹ گیا ہو، اور آخر میں ایک دھاگے سے لٹکا ہوا ہو، تو قریب ہے کہ وہ دھاگہ بھی ٹوٹ جائے۔

۲۔ایک قول کے مطابق یہاں حساب قریب ہونے سے مراد قبر کا حساب

ہے کہ جب کوئی بندہ فوت ہوتا ہے تو قبر میں اس کا حساب ہوتا ہے۔

اس کی تائید نبی پاک، صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان عالی شان سے ہوتی ہے: مَنۡ مَاتَ فقد قامت قیامته .[میزان الحکمة رقم الحدیث: ۱۹۱۲۲]

ترجمہ: جوفوت ہوگیا، اس پر قیامت قائم ہوگئی۔

۳۔ یا مطلب یہ ہے کہ حساب و کتاب کا وقت اللہ رب العزت کے نزدیک قریب ہے اگر چہ لوگوں کے نزدیک بعید ہے چونکہ جس چیز کو ہم دور سے دیکھتے ہیں اللہ پاک اس کو قریب سے دیکھتا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے شمار کرنے اور اللہ پاک کے شمار کرنے میں فرق ہے ہم جسے ہزار سال شمار کرتے ہیں اللہ رب العزت کے نزدیک وہ ایک دن کی مثل ہے۔

ارشاد خداوندی ہے ۔﴿اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴾[الحج:۴۷]

ترجمہ: بے شک تمہارے رب کے یہاں ایک دن ایسا ہے جیسے تم لوگوں کی گنتی میں ہزار برس۔

﴿ مَا یَأۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَهُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ﴾[سورۃ الأنبیاء:۲]

ترجمہ: جب ان کے رب کے پاس سے انہیں کوئی نئی نصیحت آتی تو اسے نہیں سنتے مگر کھیلتے ہوئے۔

اعتراض: اللہ رب العزت کی جانب سے جو ذکر و نصیحت آتی ہے وہ بذریعہ قرآن آتی ہے اور قرآن پاک قدیم ہے نہ کہ حادث پھر اس آیت کریمہ میں محدث کیوں فرمایا گیا ہے، اس سے تو سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن پاک حادث ہے۔

جواب: ۱:۔ تفسیر بغوی میں ہے کہ یہاں ذکر سے قرآن پاک کے علاوہ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت وغیرہ مراد ہے اور اس کی نسبت اللہ رب العزت کی جانب اس لیے کی کہ اللہ پاک کی عطا اور ہدایت سے واعظ کا وعظ اور ناصح کی نصیحت وجود میں آتی ہے۔

اور حضور پاک ﷺ جو بھی حکم دیتے ہیں یا منع فرماتے ہیں وہ اللہ پاک کا ہی حکم ہے۔

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾[سورۃ النجم:۳۔۴]

ترجمہ: اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وہی جو انہیں وحی کی جاتی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ ذکر سے مراد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس کی تائید آگے کی آنے والی آیت سے ہوتی ہے کہ حضور پاک کو دیکھ کر کفار نے یہ کہا ''هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ '' کہ یہ نبی تمہارے جیسے ایک آدمی ہی تو ہیں رہا یہ کہ کفار ذکر کو کھیلتے ہوئے سنتے ہیں تو اس سے مراد حضور پاک کی پند و نصیحت اور وعظ ہیں جو آپ ان کو فرماتے تھے۔

یا پھر محدث سے مراد نزول ہے کہ جب جب اللہ پاک کی جانب سے کوئی حکم یا نصیحت نازل ہوتی ہے تو کفار اسے کھیلتے ہوئے سنتے تھے، اور مذاق اڑاتے تھے۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ﴾ [سورۃ النبیاء:۳۰]

ترجمہ: اور ہم نے ہر جاندار چیز پانی سے بنائی۔

اعتراض: آیت کریمہ تو بتاتی ہے کہ ہم نے ہر جاندار چیز پانی سے بنائی ہے جبکہ فرشتے اور جن بھی جاندار ہیں وہ تو پانی سے پیدا نہیں ہیں اللہ پاک نے فرشتوں کو نور سے اور جن کو نار سے پیدا فرمایا ہے۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے "وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّار" [الرحمٰن:۱۵]

ترجمہ: اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا فرمایا۔

جواب: یہاں "کل شی" کہا گیا لیکن یہ مطلق نہیں ہے بلکہ محسوسات اور مشاہدات مراد ہیں مثلاً: حیوانات لہذا اس تخصیص سے فرشتے اور جنات خارج ہو جائیں گے چونکہ یہ محسوسات سے نہیں ہیں۔

۲۔ یہ آیت اپنے حقیقی معنی میں ہے چونکہ تمام مخلوق پانی سے ہی پیدا کی گئی ہے بعض تو بلا واسطہ اور بعض بالواسطہ حیوان وغیرہ کی تخلیق بلا واسطہ پانی سے ہوئی ہے اور رہے فرشتے اور جنات تو یہ بالواسطہ پانی کی تخلیق ہیں، بایں طور کہ فرشتے ہوا سے پیدا کیے گئے اور ہوا پانی سے پیدا ہے تو بالواسطہ فرشتے بھی پانی سے پیدا ہیں۔

اسی طرح جنات کو آگ سے پیدا فرمایا اور آگ کی تخلیق پانی سے ہے۔

﴿خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ﴾[سورة النبياء:۳۷]

ترجمہ: آدمی جلد باز بنایا گیا، اب میں تمہیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، مجھ سے جلدی نہ کرو۔

اعتراض: ایک طرف یہ فرمان ہے کہ انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ جلد بازی مت کر یہ تو تکلیف مالا یطاق ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

جواب: بلا شبہ انسان کو جلد باز بنایا گیا لیکن ترک عجلت کی اسے قوت بھی اللہ پاک نے بخشی ہے کہ اس قوت و طاقت کی مدد سے وہ جلد بازی چھوڑے اور اللہ پاک کے امر کی بجا آوری میں کوشاں رہے لہذا نہ یہ تکلیف مالایطلق ہے اور نہ ہی اس میں کوئی تعارض ہے۔

﴿قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾[الأنبياء: ٦٩]

ترجمہ: ہم نے فرمایا: اے آگ! ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔

اعتراض: اللہ پاک نے آگ سے خطاب فرمایا جو غیر معقول ہے۔ اور خطاب تو معقول سے کیا جاتا ہے اور فائدہ بھی معقول سے خطاب کرنے میں حاصل ہوتا ہے۔

جواب: خطاب دو طرح کا ہے تشریعی اور تکوینی، خطاب تشریعی اس سے کیا جاتا ہے جس میں عقل شعور ہو، اور رہا خطاب تکوینی تو وہ معقول اور غیر

معقول سب کو عام ہے چونکہ خطاب تکوینی میں تنفیذ اجباری ہوتی ہے تو اس میں اختیار کا معاملہ ہی نہیں ہوتا اور اس طرح کا خطاب قرآن کریم میں مختلف مقامات پر وارد ہے۔

اللہ پاک نے پہاڑوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ''
[السبا:۱۰]

ترجمہ: اے پہاڑو! اس کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرو۔

اسی طرح زمین و آسمان کو یوں خطاب فرمایا: ''ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ'' [حم سجدہ:۱۱]

ترجمہ: پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا تو اس سے اور زمین سے فرمایا دونوں حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے، تو دونوں نے عرض کی کہ ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ [سورۃ الأنبياء:۱۰۷]

ترجمہ: اور (اے محبوب) ہم نے آپ کو نہ بھیجا مگر تمام جہان کے لیے رحمت بنا کر۔

اعتراض: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صرف مومنین کے لیے رحمت بن کر آئے ہیں نہ کہ کافروں کے لیے۔ بلکہ ان کے لیے تو آپ کا تشریف لانا ایک قسم کا عذاب کا سبب بنا چونکہ ارشاد الٰہی ہے ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ [الإسراء:۱۵]

ترجمہ: اور ہم عذاب کرنے والے نہیں جب تک رسول نہ بھیج دیں۔

جواب: ا۔حضور اقدس اللہ علیہ وسلم تمام جہان کے لیے رحمت بن کر تشریف لاتے ہیں خواہ مومن ہوں یا کافر، ملحد ہوں یا مشرک، الغرض آپ تمام جہان کے لیے رحمت ہیں۔

کفار کے لیے آپ رحمت یوں ہیں کہ آپ کے سبب ان کے عذاب میں تاخیر ہوئی ورنہ تو ان کو فوراً عذاب دے دیا جاتا، قرآن پاک میں ہے ''وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ [الأنفال:۳۳]

ترجمہ: اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب دے جب تک کہ اے محبوب! تم ان میں تشریف فرما ہو۔

۲۔حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی رحمت سب کو عام ہے اور اس کے عموم کے معنی یہ ہیں کہ جو بھی آپ کی اتباع کرے اس کو اس رحمت سے حصہ ملے گا اور اس کو فائدہ پہنچے گا اب اگر کفار نے کوتاہی کی اور اتباع نہ لی تو ان کی طرف سے یہ محرومی ہے نہ کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے۔

ایک قول یہ ہے رحمت سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے رحیم تھے ان مومنین و کفار سب کے لیے اس کی گواہی آپ کی سیرت طیبہ ہے۔کہ آپ پر اتنے ظلم وستم ہوئے، غزوۂ احد میں آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے، طائف والوں نے آپ کو لہولہان کیا پھر بھی آپ نے دعائے ہلاکت نہ فرمائی بلکہ آپ نے فرمایا: ''اللهم اهد قومي فانهم لا يعلمون'' کہ اے مولیٰ! میری قوم کو ہدایت دے اس لیے کہ یہ انجان قوم ہے۔

❁❁❁❁❁

سورة الحج

﴿وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودُ وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ مَدْيَنَ ۖ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ﴾
[الحج: ۴۲-۴۴]

ترجمہ: اور اگر یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بے شک اس سے پہلے جھٹلا چکی ہے نوح کی قوم، اور عاد و ثمود اور ابرہیم کی قوم اور لوط کی قوم اور مدین والے، اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا۔

اعتراض: دیگر انبیا کے جھٹلانے کا ذکر کیا تو فرمایا کہ ان کی قوم نے ان کو جھٹلایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانے کی نسبت آپ کی قوم کی طرف نہ کی بلکہ صیغہ مجہول کے ذریعہ ذکر فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا گیا، اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل نے آپ کو نہیں جھٹلایا بلکہ آپ کی قوم کے علاوہ جو قبط سے تھے فرعون اور اس کی قوم وغیرہ ان سب نے آپ کی تکذیب کی تھی اسی لیے آپ کی قوم کی طرف تکذیب کی نسبت نہیں کی گئی کہ آپ کی قوم نے آپ کو نہ جھٹلایا تھا۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ﴾ [الحج: ۵۲]

ترجمہ: اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر بھی یہ واقعہ

گزرا ہے کہ جب انہوں نے کچھ پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔

اعتراض: نبی اور رسول میں کیا فرق ہے؟ یہ آیت کریمہ تو بتاتی ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں۔

جواب: اس بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں ذیل میں ان کو ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ایک قول یہ ہے کہ نبی و رسول کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔دونوں ایک ہی ہیں اور ایک دوسرے پر دونوں لفظوں کا اطلاق ہوتا ہے۔

۲۔ نبی اور رسول میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے، نبی عام ہے اور رسول خاص ہے۔

۳۔ نبی وہ ہے جس پر وحی آتی ہو اور اس کو شریعت سابقہ کی تبلیغ کا حکم ہوا ہو، اور رسول وہ ہے جس پر وحی آتی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس کو نئی شریعت لے کر کر آیا ہو۔

۳۔ نبی وہ ہے جسے تبلیغ کا حکم نہ دیا گیا ہو اور رسول وہ ہے کہ اسے تبلیغ کا حکم دیا گیا ہو۔

قول ثانی پر یہ اشتکال باقی رہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے اور نبی وہ ہے جسے سابقہ شریعت کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہو لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے تو کوئی رسول ہی نہیں گزرا کہ اس کی شریعت کی آپ تبلیغ کرتے۔

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج:۷۸]

ترجمہ: اور تم پر دین میں کچھ تنگی نہ رکھی۔

اعتراض: بعض معاملات میں ہم دیکھتے ہیں کہ تنگی نظر آتی ہے مثلاً انسان کے انمول یاتھ کو صرف دس درہم چوری پر کاٹنے کا حکم ہے، شادی شدہ اگر زنا کر بیٹھے تو اس کے لیے رجم کا حکم ہے۔ صرف ایک روزے کے کفارے میں پے در پے ساٹھ روزے رکھنے کا حکم اور اگر درمیان میں ایک روزہ بھی چھوٹ جائے تو پھر سے شروع کرنے کا حکم، اس کے علاوہ بھی مثالیں ہیں۔

جواب: ا۔ اس آیت کریمہ میں دین سے مراد کلمۂ توحید ہے اور یہ کلمہ کفر وشرک اور اس کے دمیان کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے خواہ بندہ ستر سال تک کفر وشرک کی گہرائیوں میں رہا ہو لیکن ایک بار کلمہ توحید پڑھنے سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو یہ دین میں آسانی ہے نہ کہ تنگی۔

۲۔ یا دین میں تنگی نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان سے کسی بھی طرح کا گناہ واقع ہو جائے شریعت نے اس سے خلاصی اور چھٹکارے کے لیے راستہ رکھا ہے خواہ وہ توبہ کے ذریعہ ہو یا کفارہ اور رخصت کے ذریعہ ہو۔

۳۔ تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اللہ پاک نے ہم سے کونسی تنگی اور حرج کو دور فرما دیا انہوں نے فرمایا: بنی اسرائیل پر جو مشکل احکام تھے ان کا بوجھ تم سے اتار دیا۔

[تفسیر ابن ابی حاتم: رقم الحدیث: ۱۴۰۳۳]

سورۃ المومنون

﴿فَلَآ أَنسَابَ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَئِذٖ وَلَا يَتَسَآءَلُونَ﴾[المؤمنون: ۱]

ترجمہ: تو نہ ان میں رشتے رہیں گے اور نہ ایک دوسرے کو آپس میں پوچھیں گے۔

اعتراض: اس آیت میں ذکر ہے کہ لوگ روز قیامت ایک دوسرے سے کچھ نہ پوچھیں گے اور سورہ صافات کی آیت میں ہے "﴿وَأَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلَىٰ بَعۡضٖ يَتَسَآءَلُونَ﴾[المؤمنون: ۲۵]

اور وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے سوال کریں گے۔

اب تو دونوں آیتوں میں تعارض ہو گیا۔

جواب: قیامت کا دن پچاس ہزار برس کا ہوگا، اس دن میں مختلف احوال اور مختلف مقامات ہوں گے لہذا کسی مقام پر ایک دوسرے سے کچھ نہ پوچھیں گے تو دوسرے مقام پر سوال کریں گے اور پوچھیں گے لہذا اب تعارض نہ رہا کیوں کہ یہ مختلف احوال و مواقع کے اعتبار سے ہے۔

﴿أَمۡ يَقُولُونَ بِهِۦ جِنَّةُۢۚ بَلۡ جَآءَهُم بِٱلۡحَقِّ وَأَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَقِّ كَٰرِهُونَ﴾[المؤمنون: ۷۰]

ترجمہ: یا (کفار) کہتے کہ اس رسول پر جنون طاری ہے بلکہ وہ ان کے پاس حق کے ساتھ تشریف لائے اور ان کافروں میں اکثر حق کو ناپسند کرنے والے ہیں۔

اعتراض: حق سے مراد توحید ہے یا قرآن کریم، اور کفار مکہ تو سبھی اس کو ناپسند کرتے تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ سب کہتے تھے ان رسول پر جنون طاری ہو گیا ہے، جب سب کا یہ حال تھا تو اکثر کا قول کیوں کیا کہ اکثر کفار حق کو ناپسند کرنے والے ہیں، اس سے تو سمجھ میں آتا ہے کہ کچھ لوگ اس کو پسند بھی کرتے تھے۔

جواب: اکثر کا اطلاق اس لیے کیا کہ بعض ان میں ایسے بھی تھے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حق جانتے تھے اور اس حق کو ناپسند بھی نہیں کرتے تھے لیکن وہ صرف اپنی قوم وگروہ کے طعن وتشنیع کے خوف سے ایمان نہ لائے جیسے ابوطالب وغیرہ۔

سورۃالنور

﴿اَلزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذَٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾

[النور:۳]

ترجمہ: بدکار مرد نکاح نہ کرے مگر بدکارہ عورت سے یا شرک کرنے والی سے اور بدکارہ عورت سے نکاح نہ کرے مگر بدکار مرد یا مشرک، اور یہ کام ایمان والوں پر حرام ہے۔

اعتراض: آیت کریمہ میں جو ممانعت مذکور ہے ہم اس کے برعکس مشاہدہ کرتے ہیں کہ بدکار عورت نیک اور مسلم سے نکاح کرتی ہے اسی طرح نیک اور مسلم عورت بدکار اور فاسق وفاجر مرد سے نکاح کر لیتی ہے۔

جواب: مذکورہ آیت مقدسہ کا مطلب یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بدکاری اور زناکاری کرنے والے اپنی طرح بدکار عورت ہی سے نکاح کرنے میں رغبت رکھتے ہیں اسی طرح بدکارہ، اور زانیہ عورتیں بھی اپنی طرح بدکار فاسق وفاجر مرد کے ساتھ نکاح کرنے میں رغبت رکھتی ہیں۔

امام کرخی بیان فرماتے ہیں: فاسق خبیث جو زنا کرتا ہے وہ کسی نیک خاتون سے نکاح کرنے کو پسند نہیں کرتا ہے وہ اپنی مثل فاسقہ و فاجرہ میں رغبت رکھتا ہے اسی طرح فاسقہ خبیثہ عورت کسی نیک باشرع متقی اور پرہیزگار سے نکاح کو پسند نہیں کرتی ہے بلکہ اس سے وہ متنفر ہوتی ہے اور اپنے جیسا فاسق وفاجر کی تلاش میں رہتی ہے۔

ہم اپنے زمانہ میں بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک فیشن باز ماڈرن لڑکی کسی باشرع، نمازی اور داڑھی والے مرد سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتی ہے۔

﴿وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ﴾[النور: ۳۱]

ترجمہ: اور اپنا سنگھار ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر۔

اعتراض: سورہ نور کی ایک طویل آیت کا جز ہے اس طویل آیت میں اللہ پاک نے بتایا کہ عورت اپنے سنگھار اور زیب و زینت کو کس کے سامنے ظاہر کر سکتی ہے؟ ان میں محارم کو شمار کرایا لیکن محارم میں چچا اور ماموں بھی داخل ہیں ان سے بھی پردہ نہیں ہے تو ان کا ذکر کیوں نہیں کیا جبکہ باقی کا ذکر کیا ہے۔

جواب: اللہ پاک حاکم مطلق ہے اور حاکم کا کوئی بھی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔

امام عامر شعبی سے یہی سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ آیت کریمہ میں جن جن کا استثنا فرمایا وہ اور ان کے بیٹے دونوں محارم میں داخل ہیں سوائے ماموں اور چچا کے، اب ماموں اور چچا تو محارم میں ہیں لیکن ان کے بیٹے محارم میں داخل نہیں ان سے نکاح جائز ہے لہذا ایسا نہ ہو کہ چچا یا ماموں اس لڑکی یا عورت کے اوصاف اپنے بیٹو سے بیان کر دیں اب ان بیٹوں کے ذریعہ سے فتنہ کا اندیشہ ہو اسی لیے ان کا ذکر نہ فرمایا، چونکہ یہاں ایک طرح کا احتمال فتنہ تھا تو از سر نو اس کو ختم فرما دیا۔

لیکن اس جواب پر اشکال وارد ہو سکتا ہے۔فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِی

الْأَلْبَابِ.

﴿فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ﴾[سورة النور: ٦١]

ترجمہ: پھر جب کسی گھر میں جاؤ تو خود کو سلام کرو۔

اعتراض: سلام کے معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ جب ہم کسی سے ''السلام علیکم'' کہتے ہیں تو معنی ہوتا ہے: اللہ پاک تمہیں سلامت رکھے پھر آیت میں یہ خود اپنے اوپر سلام کرنے کا مطلب کیا ہے؟ کہ جب کسی کے گھر جاؤ تو خود کو سلام کرو۔

جواب: ا۔ یہاں آیت کے معنی یہ ہیں جب کسی گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو۔

۲:۔ ایک قول یہ ہے کہ جب کسی گھر میں جاؤ اور گھر میں کوئی نہ ہو تو خود کو سلام بھیجو، اب معنی ہوگا کہ اے اللہ ہمیں امن و سلامتی عطا فرما۔

سورة الشعراء

﴿فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾[الشعراء:
١٦]

ترجمہ: توتم دونوں فرعون کے پاس جاؤ پھراس سے کہوہم اس کے رسول ہیں جورب ہے سارے جہان کا۔

اعتراض: حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں فرعون کے پاس گئے تھے اس لحاظ سے تثنیہ کا صیغہ ہونا چاہیے'' انا رسولا رب العالمین '' جبکہ مذکورہ آیت میں رسول واحد کا صیغہ ذکر کیا ہے۔

اوراس کی دلیل سورہ طہٰ کی آیت ہے کہ وہاں جب اس واقعہ کوذکرفرمایاتو ارشادہوا۔

﴿فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ﴾[طه:47]

جواب: لفظ رسول کبھی مرسَل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی رسالت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔پس جہاں مرسل کے معنی میں ہووہاں واحد،تثنیہ اورجمع کی رعایت لازم وضروری ہے لہذا سورۃ طہٰ میں رسول بمعنی مرسل ہے اسی لیے وہاں تثنیہ کا صیغہ ذکرکیاہے،اورآیت مذکورہ میں لفظ رسول رسالت کے معنی میں ہے اور جب لفظ رسول رسالت کے معنی میں ہوتو واحد تثنیہ اورجمع سب پراس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کی تائید کہ رسول رسالت کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے عباس بن مرداس کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

أَلا مَن مُبْلِغٌ عَنِّي خُفَافًا   رسولا بيت أهلك منتها ها.

ترجمہ:

اس شعر میں رسول رسالت کے معنیٰ میں ہے اسی لیے ''منتہاھا ''میں ضمیر مؤنث ذکر کی ہے۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ دونوں رسول اخوت، شریعت اور رسالت میں متفق تھے اسی لیے دونوں حضرات کو نفس واحد کی منزل میں اتار کر کلام کیا گیا ہے۔

۳۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عبارت محذوف ہو اور اصل عبارت یوں ہو: ان کل واحد منا رسول رب العالمین.

﴿قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَأَنَا۠ مِنَ ٱلضَّآلِّينَ﴾[الشعراء:۲۰]

ترجمہ: موسیٰ نے فرمایا: میں نے وہ کام اس وقت کیا جبکہ مجھے راہ کی خبر نہ تھی۔

اعتراض: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں گمراہوں میں سے تھا جبکہ کوئی بھی نبی گمراہ نہیں ہوسکتا ہے تمام انبیا ہمیشہ راہ ہدایت پر رہے اور گمراہی پر ہو بھی کیسے سکتے ہیں وہ تو گمراہوں کو راہ راست پر لانے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

جواب: بلا شبہ تمام انبیا معصوم اور راہ ہدایت پر تھے مذکورہ آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ''انا من الضالین ''فرمایا یہ اس مشہور معنیٰ نہیں

ہے جو شائع ہے۔آپ نے قبطی کو طمانچہ مارا جس سے وہ فوت ہو گیا اس وقت آپ نے بطور عذر یہ فرمایا تھا۔

امام آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں اس کی درج ذیل تو جیہات فرمائی ہیں۔

ا۔ضالین سے مراد ہے جاہلین ہے کہ میں بے خبر تھا یہ قول حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے۔

۲۔اس کے معنی ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے طمانچے کی قوت سے بے خبر تھے آپ نے تو وہ طمانچہ بغرض تادیب مارا تھا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فوت ہو گیا۔

۳۔یہاں ضلالت محبت کے معنی میں ہے، چونکہ لفظ ضلالت محبت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن پاک میں ہے۔حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے آپ سے کہا:

﴿قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ﴾[یوسف:۹۵]

ترجمہ: بیٹے بولے خدا کی قسم! آپ اپنی اسی پرانی خودرفتگی میں ہیں۔

تفسیر طبری میں ہے کہ ضلالت یہاں خطا کے معنی میں ہے۔بعض نے فرمایا کہ یہاں بھولنا مراد ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کام بھولے سے ہوا۔چونکہ قرآن پاک میں ضلالت نسیان کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے:﴿أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ﴾[البقرة:۲۸۲]

ترجمہ: کہ اگر ان میں سے ایک عورت بھولے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔

﴿فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ، فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ﴾

[الشعراء:۱۵۸-۱۵۷]

ترجمہ: توانہوں نے اس کے پاؤں کی رگیں کاٹ دیں پھر صبح کو پچھتاتے رہ گئے تو انہیں عذاب نے پکڑ لیا۔

اعتراض : حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے جب اونٹنی کی کوچیں کاٹ دی پھر انہیں اس پر ندامت ہوئی۔ اور ندامت ہی توبہ ہے کہ حدیث پاک میں ہے ''الندامۃ توبۃ'' پھر توبہ کے بعد انہیں عذاب کیوں دیا گیا؟

جواب : ا۔اس کی تفسیر میں رئیس المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس قوم نے جب عذاب دیکھ لیا تب ان کو ندامت ہوئی اور یہ توبہ کا وقت نہیں ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ﴾

[النساء:۱۸]

ترجمہ: اور توبہ ان کی نہیں جو گناہوں میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے تو کہے اب میں نے توبہ کی۔

۲۔ یا ان لوگوں نے عذاب کے خوف سے توبہ کی تھی نہ کہ ندامت کے طور پر لہذا یہ ندامت ان کے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہوئی۔

❀❀❀❀❀

سورۃ النمل

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ﴾[النمل: ۱]

ترجمہ: یہ قرآن اور روشن کتاب کی آیتیں ہیں۔

اعتراض: کتاب مبین کا قرآن پر عطف کیا گیا اور عطف مغایرت چاہتا ہے لیکن یہاں مغایرت نہیں ہے چونکہ کتاب مبین سے بھی قرآن پاک مراد ہے، اب قرآن اور کتاب مبین ایک ہی ہیں تو مغایرت پائی ہی نہ گئی اور عطف مغایرت چاہتا ہے۔

جواب: ۱۔اس آیت کریمہ میں کتاب مبین سے مراد لوح محفوظ ہے لہذا کوئی اشکال نہ رہا۔

زمخشری کا کہنا ہے کہ عطف مطلقاً مغایرت کو چاہتا ہے خواہ لفظاً مغایرت ہو یا پھر معنوی طور پر ہو، لہذا اس طرح کی آیات میں جہاں لفظاً مغایرت نہیں پائی جاتی ہے وہاں معنوی طور پر مغایرت پائی جاتی ہے۔

۲۔:امام ابن عاشور نے'' التحریر والتنویر ''میں فرمایا: کتاب مبین سے لوح محفوظ مراد لینے یا اور کسی قسم کی تاویل کرنے کی کوئی حاجت نہیں اس لیے کہ یہاں ایک صفت کا دوسری صفت پر عطف کیا گیا ہے اور کلام عرب میں یہ شائع ہے کہ وہ چند صفات کو ایک دوسرے پر عطف کرکے ذکر کردیتے ہیں اگرچہ ان میں کوئی مغایرت نہ ہو چونکہ بعض صفات کا دیگر بعض پر عطف کرنا جائز و درست ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ﴾[النمل:۴]

ترجمہ: وہ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم ان کے برے اعمال ان کی نگاہ میں بھلے کر دکھاتے ہیں تو وہ بھٹک رہے ہیں۔

اعتراض: اس آیت کریمہ پر دو اعتراض ہوتے ہیں۔

اول: جب کافروں کے کارناموں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود ہی ان کے لیے مزین کر دیا اور خوشنما بنا دیا تو جب وہ کام کرتے ہیں تو ان پر ملامت کیوں ؟ اور ان کے لیے مذمت اور عذاب شدید کی سخت وعیدیں کیوں؟

دوم: اس آیت میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار کے اعمال کو ان کے لیے مزین فرما دیا اور دوسرے مقام پر ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے مزین کیا ہے۔

ارشاد باری ہے: ﴿وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ﴾
[الأنفال:۴۸]

ترجمہ: اور جب شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو مزین کر دیا۔

لہذا دونوں آیتوں میں تعارض ہو گیا۔

جواب: پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اللہ رب العزت ہر چیز کا خالق ہے اسی طرح بندوں کے اعمال کا بھی وہی خالق ہے، ہاں بندہ اپنے اعمال کا سبب ضرور ہے لہذا جب بندہ کسی فعل کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تب اللہ تبارک وتعالیٰ اس فعل کو پیدا فرما دیتا ہے۔ کفار و مشرکین نے جب کفر وشرک اور

برے اعمال کا ارادہ کیا تو اللہ پاک نے ان کے لیے ان اعمال کو مزین فرما دیا۔

ورنہ تو اس نے بندہ کو دونوں راستے دکھا دیے اور کسب کا اختیار اسے دے دیا۔

﴿ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴾[الدھر:۳]

ترجمہ: بے شک ہم نے اسے راہ بتادی یا حق مانتا یا ناشکری کرتا۔

علمائے کرام نے ایک جواب یہ بھی دیا ہے کہ جب کفار نے تسلسل اور تواتر کے ساتھ کفر و شرک کیا۔ انبیا و رسل کی تکذیب کی، آخرت کا انکار کیا تو رب تبارک وتعالیٰ نے بطور سزا ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور ان کے لیے اعمال قبیحہ کو خوشگوار بنا دیا۔

دوسرے اعتراض کا جواب:

اللہ پاک نے ان کے اعمال کو مزین فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ ان کفار و مشرکین میں خواہشات اور شہوت کو پیدا فرمایا، اور شیطان کی طرف ان کے اعمال کی تزیین کی نسبت سے مراد یہ ہے کہ اس نے ان کے دلوں میں وسوسے ڈالے، غرور و تکبر بھر دیا، لہٰذا اس لحاظ سے دونوں کی طرف نسبت کرنا جائز و درست ہے۔

حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ تزیینِ اعمال کی نسبت اللہ رب العزت کی طرف کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک نے ان کے لیے نیک اعمال کو مزین فرما دیا ہے۔ اس کے باوجود کفار و مشرکین اپنے برے اعمال میں ملوث رہے۔

﴿ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا ﴾[النمل: ۲۱]

ترجمہ: (سلیمان نے فرمایا) میں ضرور ضرور اسے (ہدہد کو) سخت عذاب دوں گا۔

اعتراض: اللہ رب العزت کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس کی مخلوق کو عذاب دے پھر سلیمان علیہ السلام کے لیے کیوں کر اس پرندہ کو عذاب دینا جائز ہو گیا کہ آپ نے فرمایا کہ میں اسے سخت عذاب دوں گا۔

جواب: ا۔ ممکن ہے کہ اللہ پاک نے بطور خاص آپ کے لیے یہ جائز فرما دیا ہو لہذا یہ آپ کا خاصہ ہو گا جس طرح آپ پرندوں کی زبان سمجھتے تھے اور پرندے آپ کے تابع تھے۔

﴿قَالَ الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾[النمل: ۴۰]

ترجمہ: اس نے عرض کی جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اسے آپ کی بارگاہ میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا۔

اعتراض: آصف بن برخیا حضرت سلیمان علیہ السلام کے کاتب تھے ،وہ نبی نہ تھے پھر بھی ایسا فعل انجام دے دیا جو نبی انجام نہ دے سکا۔

جواب: ا۔ ممکن ہے کہ غیر نبی کو بطور کرامت ایسی خصوصیت حاصل ہو جائے جس میں نبی شریک نہ ہو مثلاً: حضرت مریم کے لیے جنت سے پھل آتے تھے اور وہ بھی بے موسم کے عمدہ پھل لیکن حضرت زکریا اس خصوصیت میں شریک نہ تھے لیکن اس سے غیر نبی کا نبی سے افضل ہونا لازم نہیں آتا ہے۔

۲۔ مذکورہ واقعہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تخت لانے پر قادر نہ تھے اور نہ ہی اس کا ذکر واقعہ میں ہے، وہ تو بس اپنے ماتحت رہنے والے جنّ وانس کی طاقت جاننا چارہے تھے۔

❁❁❁❁❁

سورۃ القصص

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ﴾[القصص:۷]

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا کہ اسے دودھ پلا۔

اعتراض: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو جو وحی یا الہام ہوا کہ حضرت موسیٰ کو دودھ پلائیں تو اس الہام میں کیا حکمت ہے؟ جبکہ بچہ کو دودھ پلانا ایک امر طبعی ہے ہر ماں اپنے بچے کو پلاتی ہے۔

جواب: اس امر میں حکمت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے دودھ سے مانوس ہو جائیں پھر فرعون کے دربار میں جا کر کسی دوسری عورت کے دودھ کا پییں اور پھر آپ کی والدہ کو جانا پڑے اور یہ ملاقات کا ذریعہ بنے ورنہ بسا اوقات ہوتا ہے کہ بچہ کی ولادت کے بعد رضاعت کے طور پر کسی دوسری عورت کا دودھ پلا دیا جاتا ہے۔

﴿قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ﴾[القصص:۲۷]

ترجمہ: (شعیب نے) کہا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا آپ کے ساتھ نکاح کر دوں۔

اعتراض: اس نکاح میں جہالت ہے کہ دونوں بیٹیوں میں سے تعین نہیں ہے کہ کس کے ساتھ نکاح کریں گے۔ لہذا جہالت کی صورت میں نکاح نافذ نہیں ہو سکتا ہے؟

جواب: ایک نکاح ہوتا ہے اور ایک وعدہ نکاح ہوتا ہے تو مذکورہ آیت

مبارکہ میں حضرت شعیب علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا بلکہ صرف ایک وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنی ایک بیٹی موسیٰ علیہ السلام کے نکاح میں دیں گے، اس کے بعد جس وقت نکاح کیا اس وقت متعین کر دیا تھا لہذا اب کوئی جہالت نہ رہی۔

﴿قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ﴾[القصص:۲۷]

ترجمہ: کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی دونوں بیٹیوں میں سے ایک کو آپ کے نکاح میں دے دوں کہ تم آٹھ سال تک میری ملازمت کرو۔

اعتراض: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مال کے علاوہ خدمت کرنا بھی مہر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے خدمت کے عوض اپنی بیٹی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نکاح میں دی اور شوافع اور مالکیہ وغیرہ کا موقف و مذہب بھی ہے۔

جواب: احناف کے نزدیک قرآن پاک کی واضح آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ مہر کے لیے مال ہونا ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ﴾[القصص:۲۴]

ترجمہ: اور ان کے سوا جو ہیں وہ تمہیں حلال ہیں کہ اپنے مالوں کے عوض تلاش کرو۔

یہ آیت کریمہ دلیل ہے مہر کے لیے مال لازم ہے۔

اور رہا حضرت شعیب علیہ السلام کے قصہ سے اعتراض تو ممکن ہے کہ آپ کی شریعت میں یہ جائز رہا ہو اور امت محمدیہ میں یہ حکم منسوخ ہو گیا ہو۔

اور دوسری بات یہ کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی خدمت کی شرط لگائی تھی نا کہ اپنی بیٹی کی لہذا یہ منفعت حضرت شعیب علیہ السلام کو حاصل ہوئی، آپ نے فرمایا تھا: علی ان تاجرنی ثمانی حجج:

پس یہ نکاح بنا مہر کے ہوا تھا اور آٹھ سال ولی کی خدمت کی شرط لگائی گئی تھی۔ [احکام القرآن للجصاص، ج ۳، ص: ۴۴۳]

﴿فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِيٓ إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ﴾ [القصص: ۳۴]

ترجمہ: تو اسے (ہارون) کو میری مدد کے لیے رسول بنا، تا کہ وہ میری تصدیق کرے۔

اعتراض: حضرت ہارون علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے کا کیا معنی ہے؟ کیا فرعون کے پاس جا کر کہیں کہ موسیٰ اپنے دعوی رسالت میں سچے ہیں۔

جواب: اس آیت کریمہ میں تصدیق کے یہ معنی نہیں ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام فرعون سے کہیں کہ ہاں موسیٰ اپنے دعوی میں سچے ہیں۔ چوں کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا اس لیے کہ فرعون اور اس کی قوم کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ظاہر و باہر اور بڑے بڑے معجزے دکھائے اس نے اور اس کی قوم نے پھر بھی تصدیق نہ کی تو صرف حضرت ہارون کی

تصدیق کرنے سے کس طرح تصدیق کر سکتے ہیں؟

بلکہ یہاں یہ معنی ہے کہ حضرت ہارون کی زبان زیادہ صاف اور واضح ہے اس لیے وہ اپنی زبان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل و براہین کو اور بھی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں اور اس دعوئے سالت میں برابر فرعون سے مقابلہ ومجادلہ کریں۔

آیت کریمہ کے پہلے جزء سے اس کی وضاحت ہوتی ہے چنانچہ آپ نے فرمایا:

﴿ وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي﴾ [القصص: ۳۴]

ترجمہ۔ اور میرا بھائی ہارون اس کی زبان مجھ سے زیادہ صاف ہے تو اسے میری مدد کے لیے رسول بنا کہ وہ میری تصدیق کرے۔

❁❁❁❁❁

سورة العنكبوت

﴿وَمَا هُم بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُم مِّن شَيْءٍ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ﴾

[العنکبوت:۱۲۔۱۳]

ترجمہ: اور وہ کافران (مومنوں) کے گناہوں میں سے کچھ بھی بوجھ نہ اٹھائیں گے بے شک وہ جھوٹے ہیں، اور بے شک وہ (کافر) ضرور اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ اٹھائیں گے۔

اعتراض: پہلی آیت میں ہے کہ روز قیامت کفار مومنین کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھائیں گے، وہیں اگلی آیت بتاتی ہے کہ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے اور اس کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اب تو دونوں آیتوں میں تعارض ہو گیا۔

جواب: پہلی آیت کریمہ میں جہاں ممانعت وارد ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مومنین نے جو خطاوں اور گناہوں کا ارتکاب کیا ہے، کفار ان کا بوجھ نہ اٹھائیں گے اور یہی مطلب ہے اللہ پاک کے اس ارشاد کا۔

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾[الإسراء:۱۵]

کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہ اٹھائے گی۔

دوسری آیت کریمہ جہاں بتایا گیا کہ یہ کفار دوسروں کا بوجھ اٹھائیں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے جن کو گمراہ کیا، ایمان لانے سے روکا اور گمراہی کا راستہ دکھایا ہے تو اس گمرہی اور بھٹکانے کا گناہ ان کفار کے سر جائے

گا، ساتھ ہی جو گمراہ ہوئے ان کے گناہوں سے بھی کچھ کم نہ کیا جائے گا۔
اس کی وضاحت صحیح مسلم کی حدیث پاک سے ہوتی ہے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اسے اس کا اجر ملے گا، اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اسے ملے گا اور ان لوگوں کے اجر سے کچھ کم نہ کیا جائے گا، اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا تو اس کا گناہ اسے ملے گا، اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی اس کو ملے گا اور ان کے گناہوں سے کچھ کم نہ کیا جائے گا۔ (صحیح مسلم: کتاب الزکاۃ: رقم الحدیث: ۱۰۱۷)

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾[العنکبوت:14]

ترجمہ: اور بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو وہ ان میں پچاس سال کم ہزار برس رہا۔

اعتراض: مذکورہ آیت کریمہ میں لفظ "سنة" اور لفظ "عاما" کا ذکر ہوا، دونوں کا معنیٰ سال ہے پھر دو الگ الگ لفظوں کو ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ جب معنیٰ ایک ہے۔

جواب: اہل عرب کی یہ عادت ہے کہ وہ کلام میں ایک ہی لفظ کی تکرار پسند نہیں کرتے ہیں، اسے وہ فصاحت سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔

اور قرآن پاک تو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر ہے تو اس میں اس کی رعایت بدرجہ اعلیٰ کی گئی ہے اس لیے تکرار سے اجتناب کرتے ہوئے لفظ "سنة" کا مراد "عاما" ذکر کر دیا گیا۔

❁❁❁❁❁

سورۃ الروم

﴿وَ هُوَ الَّذِیۡ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ وَ هُوَ اَهۡوَنُ عَلَیۡهِ﴾

[الروم:۲۷]

ترجمہ: اور وہی ہے جو اول بناتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا اور دوسری مرتبہ بنانا اللہ پر پہلی مرتبہ بنانے سے زیادہ آسان ہے۔

اعتراض: تمام افعال اللہ رب العزت کی جانب نسبت کرتے ہوئے آسان ہیں خواہ زمین وآسمان کی تخلیق ہو یا انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنا ہو، اللہ پاک پر سب آسان ہے اور اس سہولت و آسانی میں فرق تو ہماری تمہاری طرف نسبت کرتے ہوئے ہے اللہ تبارک وتعالی کے لیے نہیں۔

جواب: مذکورہ بالا آیت مقدسہ میں ''اھون'' اسم تفضیل ''ھین'' اسم فاعل کے معنی میں ہے، چوں کو اسم تفضیل کبھی اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسم تفضیل میں زیادتی اور تفاضل کا معنی نہیں پایا جاتا۔

مؤذن اذان کے وقت، اللہ اکبر اللہ اکبر کہتا ہے تو یہاں بھی اسم تفضیل اسم فاعل، اللہ کبیر اللہ کبیر کے معنی میں ہے۔

یا ہمارے گمان کے مطابق ارشاد فرمایا گیا ہو۔ چونکہ ہم انسانوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے تو معاملہ اسی طرح ہے کہ کسی چیز کو از سر نو بنانا زیادہ مشکل ہے اس سے کہ اسے دوبارہ بنایا جائے۔ اسی لحاظ سے قرآن پاک نے ہماری طرف نسبت کرتے ہوئے ہمارے گمان کے مطابق کلام فرمایا ہے۔

سورة لقمان

﴿إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ [سورہ لقمان: ۳۴]

ترجمہ: بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، اور وہ بارش اتارتا ہے۔ اور جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹ میں ہے، اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائے گا۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ علم والا اور خبر دینے والا ہے۔

اعتراض: اس آیت میں پانچ علوم کا ذکر ہوا جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص فرمایا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ انبیا ورسل اور خصوصاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ علوم خمسہ دیے گئے ہیں، اور دوسرا گروہ اس آیت کو دلیل بنا کر اس کا انکار کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کا علم نہیں دیا گیا ہے۔

جواب: سورۂ لقمان کی مذکورہ آیت مقدسہ سے مقصود ان کاہنوں اور نجومیوں کا رد کرنا ہے جو اپنے تخمینہ یا تجربہ سے بتاتے تھے کہ ان امور کا وقوع کب اور کہاں ہوگا اور کس ستارے کی گردش کے وقت پانی برسے گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کا اندازہ غلط بھی ہوتا تھا قرآن پاک نے اس چیز کو رد کیا اور بتایا کہ ان کاہنوں کو اس کا علم نہیں ہے بلکہ صحیح علم اللہ رب العزت کے پاس ہے۔ اب اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیا ورسل سے از سر نو اس کی نفی ہو

جائے، چوں کہ اللہ پاک نے اپنی عطائے خاص کے ذریعہ اپنے مخصوص بندوں کو ان علوم خمسہ سے نوازہ ہے۔

ارشادخداوندی ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ﴾[سورہ ال عمران: ۱۷۹]

ترجمہ۔ اللہ کی شان نہیں ہے کہ اے عام لوگوں! تمہیں غیب کا علم دے دے ہاں اللہ چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو اختیار فرمالیا اور ان کو ان علوم سے نوازہ ہے، قرآن وحدیث کے دلائل کثیرہ اس پر شاہد عدل ہیں۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے کفار کے قتل ہونے کی جگہ کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کون کہاں قتل ہوگا۔ فرشتوں کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ وہ لوگوں کو موت دیتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ فرما دیتے تھے اور بالتفصیل دلائل کے لیے اس موضوع پر لکھی گئی کتابیں مثلاً: الدولۃ المکیۃ، ابناء الغیب وغیرہ کی طرف رجوع کیا جائے تو بے شمار تفصیلی دلائل مل جائیں گے۔

❁❁❁❁❁

سورة السجدة

﴿يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ [سورة السجدة:۵]

ترجمہ: وہ آسمان سے زمین تک ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے پھر (ہر کام) اس دن میں اسی کی طرف رجوع کرے گا جس کی مقدار ہزار سال ہے۔

اعتراض: مذکورہ آیت مقدسہ بتاتی ہے کہ قیامت کا دن ایام دنیا کے اعتبار سے ایک ہزار سال کا ہوگا اور سورۂ معارج کی آیت بتاتی ہے قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ [سورة المعارج:۴]

ترجمہ: ملائکہ اور جبرئیل اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں (وہ عذاب) اس دن ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔

جواب: مفسرین نے دونوں آیتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ زمین سے آسمان دنیا کی مسافت ایام دنیا کے اعتبار سے ایک ہزار سال ہے۔ سورۂ سجدہ میں اسی مسافت کا ذکر ہے۔ اور زمین کے سب سے آخری طبقہ سے لیکر اوپر کے سب سے آخری آسمان تک کی مسافت ایام دنیا کے لحاظ سے پچاس ہزار سال ہے۔ سورۂ معارج میں اسی مسافت کا ذکر ہے۔

۲۔ یا مطلب یہ ہے کہ عام مومنین کے حق میں ایک ہزار برس کا دن ہوگا

اور کفار کے حق میں پچاس ہزار برس کا ہوگا، اس طور پر کہ شدت و ہولنا کی کے سبب کفار کو پچاس ہزار کا لگے گا اور مومنین کے لیے ایک ہزار سال کا اور خاص مومنین کے لیے تو اتنی جلدی گزر جائے گا کہ جیسے فرض نماز ادا کی ہو۔

مسند احمد بن حنبل میں ہے: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قیامت کا پچاس ہزار سال کا دن کس قدر طویل ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہ وقت مومنین پر بہت خفیف ہو کر گزرے گا حتی کہ مومن جتنے وقت میں دنیا میں فرض نماز ادا کرتا تھا یہ اس سے بھی کم وقت میں گزر جائے گا۔

﴿إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ [سورۃ السجدۃ: ۱۲]

ترجمہ: ہماری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کا ذکر کیا جاتا ہے تو سجدہ میں گرتے ہیں، اور اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پاکی بولتے ہیں۔

اعتراض: یہاں حصر کے ساتھ کہا گیا کہ آیات پر انہیں کا ایمان ہوگا جو ان کے ذکر کے وقت سجدہ میں گر جائیں جبکہ ایمان کے لیے خَرُّوا سُجَّدًا کی شرط نہیں ہے لہذا جو مومن ایسا نہ کرے وہ بھی مومن ہی ہے۔

جواب: ا۔ مذکورہ آیت مبارکہ میں ''ذکروا بھا'' ''وعظوا'' کے معنی میں ہے اور سجدہ میں گرنے سے حقیقی سجدہ کرنا مراد نہیں ہے بلکہ خشوع و

خضوع اور اللہ پاک کی آیات سے جو نصیحت کی جائے اس کے قبول میں تواضع اختیار کرنا ہے، لہذا یہ چیزیں ایمان کے لیے ضروری ہیں۔

۲۔ یا یہاں ایمان سے کمال ایمان مراد ہے کہ جس مومن کے اندر یہ صفت پائی جائے گی اس کا ایمان کامل ہوگا۔

﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ(۲۸) قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ﴾[سورة السجدة: ۲۹-۲۸]

ترجمہ: اور (کفار) کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اگر تم سچے ہو۔ تم فرما دو فیصلہ کے دن کافروں کو ایمان نفع نہ دے گا اور نہ انہیں مہلت ملے گی۔

اعتراض: سوال تو یہ تھا کہ فیصلہ کا دن (قیامت کا دن) کب ہے۔ لیکن جو جواب دیا گیا وہ سوال کے مطابق نہیں ہے کہ فیصلہ کے دن کافروں کو ان کا ایمان فائدہ نہ دے گا۔

جواب: سوال سے کفار کا مقصد حصول معرفت نہ تھا بلکہ ہنسی اور مذاق بنانا تھا چونکہ وہ روز قیامت کے منکر تھے۔ اور یوم الفتح سے مراد روز قیامت ہے لہذا انہوں نے بطور استہزا کہا کہ کب ہے تمہارا فیصلہ کا دن؟

❁❁❁❁❁

سورة الأحزاب

﴿وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾[سورة الاحزاب:٦]

ترجمہ:اوراس کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں۔

اعتراض: اللہ رب العزت نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کومومنین کی ماں قرار دیا کہ وہ ادب واحترام میں ماں کی طرح ہیں اوران سے نکاح حلال نہیں ہے،لیکن نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کومومنین کے باپ قرار کیوں نہیں دیا کہ اس میں حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کاادب واحرام بھی ظاہر ہوجاتااورعظمت ورفعت بھی۔

جواب: ا۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کوسب سے افضل و اشرف نام سے پکارنے کاحکم دیاہےاورعورتوں میں سب سے افضل یہ ہے کہ ماں کےلقب سے پکارجائے۔

لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے کے لیے سب سے افضل واشرف نام باپ نہیں ہے بلکہ ''رسول اللہ'' ہے اس لیےحکم ہوا کہ آپ کو ''رسول اللہ'' کہہ کرپکاراجائے۔

۲۔حضورصلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو ماں کہہ کرتمام مومنین کے لیے ان کوحرام قرار دیا یہ سب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وتعظیم کےغرض سے تھااب اگرآپ کومومنین کاباپ قرار دے دیاجاتاتوآپ سبھی مومنہ عورتوں کے بھی باپ ہوتے اس لحاظ سے تمام عورتیں آپ پرحرام ہو

جاتیں۔کسی سے نکاح جائز نہ ہوتالہذا یہ تو عظمت ورفعت کے خلاف ہوجاتا۔

﴿يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾[سورۃالاحزاب:۳۰]

ترجمہ:اے نبی کی بیبیو!تم میں جو حیا کے خلاف کوئی کھلی جرأت کرے تو اسے دوسروں کے مقابلے میں دو گناہ عذاب دیا جائے گا۔

اعتراض: ازواج مطہرات کے بارے میں یہ حکم کیوں دیا کہ ان کو گناہ پر دوسروں کے بالمقابل دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

جواب: درحقیقت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں ارشاد خداوندی ہے

''يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ''[سورۃالاحزاب:۲]

اے نبی کی بیبیو!تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

ان کا مرتبہ اور عظمت ورفعت عام عورتوں سے بہت بلند ہے اس لیے ان سے مواخذہ بھی سخت ہوگا،گناہ پر عذاب بھی سخت ہوگا چونکہ اللہ پاک کے جو نیک اور مقرب بندے ہوتے ہیں ان پر آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور مواخذہ بھی سخت ہوتا ہے۔

تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:انبیاے کرام کا مواخذہ ان کے متبعین کے بالمقابل زیادہ سخت ہوگا،علما کا مواخذہ عوام سے زیادہ سخت ہوگا اسی طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ازورج مطہرات کا مواخذہ بھی عام عورتوں سے زیادہ سخت ہوگا ان میں جو نیک عمل کرتی ہیں ان کو اجر وثواب بھی عام عورتوں سے زیادہ ملتا ہے۔

۲۔ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اگر ازواج مطہرات کسی گناہ ومعصیت کا ارتکاب کریں تو اس میں حضور پاک کو بھی اذیت پہنچانا ہے اور آپ کو اذیت وتکلیف پہنچانے کا گناہ عام لوگوں کو اذیت دینے سے زیادہ ہے۔

۳۔ایک قول یہ ہے کہ ازواج مطہرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زندگی کے شب وروز گزارے، دین کے احکام سیکھے، اور تمام امور کو قریب سے دیکھا ہے ان کے وعدو وعید کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور دوسروں کو یہ شرف نہ ملا چونکہ یہ تمام تر خصوصیات اس بات کی داعی ہیں کہ وہ گناہ کے قریب بھی نہ جائیں لہذا اس کے باوجود بھی اگر وہ ارتکاب گناہ کریں تو ضرور انہیں زیادہ عذاب دیا جائے گا۔

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾[سورۃ الاحزاب:۳۵]

ترجمہ: بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں۔

اعتراض: اس مقام پر عطف کے ساتھ مومنین اور مسلمین کا علاحدہ علاحدہ ذکر ہوا تو ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟ جبکہ بظاہر کوئی فرق نہیں لگتا۔

جواب: ا۔ مطلق جب بولا جائے تو کوئی فرق نہیں ہوتا ہے دونوں سے ایک ہی معنی مراد ہوتا ہے اور جب ایک دوسرے کے مقابل دونوں لفظ بولے جائیں تو اس طرح فرق کرتے ہیں کہ اس اسلام سے مراد انقیاد واتباع ظاہری یعنی ظاہری اعمال مراد ہوتے ہیں اور ایمان سے تصدیق قلبی مراد ہوتی ہے۔

بنی اسد کے کچھ لوگوں نے آ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اسلام ظاہر کیا لیکن ان کے دل ایمان سے خالی تھے۔ اللہ پاک نے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ۖ﴾ [سورۃ الحجرات: ۱۴]

ترجمہ: گنوار بولے ہم ایمان لائے اے محبوب تم فرماؤ: تم ایمان نہ لائے۔ ہاں یوں کہو کہ ہم اسلام لائے اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں کہاں داخل ہوا۔

حدیث جبرئیل بھی اس کی تائید میں ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایمان کے بارے میں پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ تب حضور پاک نے فرمایا: اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں اور رسولوں پر اور تقدیر پر ایمان لانا۔

اور جب اسلام کے بارے میں سوال کیا تو حضور پاک نے فرمایا: اللہ کے معبود ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ہونے کی گواہی دینے، نماز ادا کرنے، زکاۃ دینے، ماہ رمضان کے روزے رکھنے اور حج بیت اللہ کرنے کا نام اسلام ہے۔

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَٰكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ [سورۃ الاحزاب: ۴۰]

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہاں اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

اعتراض: اس میں بتا یا کہ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بیٹوں طیب، قاسم اور ابراہیم کے باپ ہیں۔

جواب: ا۔ یہ آیت کریمہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔لوگوں نے اعتراض کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبنی (منھ بولا بیٹے) کی منکوحہ سے نکاح کرلیا تب اللہ پاک نے فرمایا کہ اے لوگو! یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہ یا تمہارے کسی کے باپ نہیں ہیں کہ ان کی منکوحہ نبی کے لیے حرام ہوجائے بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں۔

۲۔ یہاں لفظ رجال فرمایا اس سے آپ کے بیٹے خارج ہوگئے اس لیے کہ ان سب کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا کوئی اس عمر کو نہ پہنچا تھا کہ اس پر ''رجل'' کا اطلاق ہوسکے اور آیت کریمہ میں اسی بات کی نفی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آدمیوں کے باپ نہیں ہیں، لہذا آیت کریمہ اپنے حقیقی معنی میں ہے، اور کوئی اشکال وارد نہیں ہوگا۔

۞۞۞۞۞

سورة سبا

﴿يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ﴾[سورۃالسبا:۱۳]

ترجمہ: اس (سلیمان علیہ السلام) کے لیے بناتے جو وہ چاہتا، اونچے اونچے محل اور تصویریں، اور بڑے حوضوں کے برابر لگن، اور لنگردار دیگیں۔

اعتراض: حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے تصویریں کیوں بنواتے تھے جبکہ تصویر بنانا اور بنوانا ناجائز وحرام ہے۔

جواب: تصویر کی حرمت شریعت محمدیہ میں ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں یہ فعل حرام یا ناجائز نہ تھا۔

ایک قول یہ ہے کہ تصویر سے جاندار کی تصویر مراد نہیں بلکہ غیر جاندار درخت وغیرہ کی تصویریں مراد ہیں۔

تفسیر قرطبی میں ہے: بیان کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں انبیائے کرام اور صالح علمائے کرام کی تصویریں مسجدوں میں بنادی جاتی تھیں تا کہ لوگ ان کی عبادت وریاضت کو یاد کرکے خوب عبادت میں کوشش کریں۔اسی طرح جب کوئی صالح اور پرہیز گار آدمی فوت ہو جاتا تو اس کی قبر پر مسجد تعمیر کرکے اس میں اس کی تصویر لگادیتے تھے لیکن یہ تمام امور ان کی شریعت میں جائز تھے اور شریعت محمدیہ میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور اب تصویر کی حرمت کا حکم ہے۔

﴿وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾

[سورۃالسبا:۲۴]

ترجمہ: اور بے شک ہم یا تم یا ضرور ہدایت پر ہوں گے یا کھلی گمراہی میں۔

اعتراض: آیت مذکورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو شک کے ساتھ کیوں بیان کیا کہ یا تو ہم ہدایت پر ہوں گے یا کفار، جبکہ یہ امر واضح ہے کہ مسلمان ہدایت پر ہیں اور کفار گمراہی پر ہیں۔

جواب: لفظ ''او'' یہاں دونوں مقام پر ''و'' کے معنی میں ہے اور یہ عبارت لف ونشر مرتب کے طور پر ہے اب آیت کے معنی یہ ہیں: کہ بے شک ہم ہدایت پر ہیں اور کفار ضلالت وگمراہی پر ہیں۔

یا پھر کفار کو مخاطب کر کے بطور تعریض کہا گیا ہے: ہم ہدایت پر ہوں یا پھر ضلالت وگمراہی پر ہوں لیکن تم اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرا کر اور کفر کر کے کس ہدایت یا گمراہی میں ہو بلکہ تم تو کھلی گمراہی پر ہو۔

سورہ یٰس

﴿إِنَّآ إِلَيۡكُمۡ مُّرۡسَلُونَ﴾[سورہ یس:۱۴]

ترجمہ: بے شک ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

اعتراض: مذکورہ آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو حواریوں کا قول ذکر فرمایا کہ ''إِنَّآ إِلَيۡكُمۡ مُّرۡسَلُونَ'' پھر اگلی آیت میں یہی قول لام تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا'' قَالُوا رَبُّنَا يَعۡلَمُ إِنَّآ إِلَيۡكُمۡ لَمُرۡسَلُونَ'' [سورہ یس:۱۶] اب اس میں کیا حکمت ہے کہ ایک مقام پر بلا لام کے ذکر فرمایا اور دوسرے مقام پر لام تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔

جواب: یہ تو قرآن پاک کا حسن اسلوب، اور حسن بلاغت ہے۔ جب حضرت عیسیٰ السلام کے حواری قوم کی طرف گئے تو ان کو خبر دی کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں لیکن جب قوم نے جھٹلایا تب انہوں نے تاکید کے ساتھ فرمایا، اور تاکید کے لیے لام ذکر کیا کہ'' إِنَّآ إِلَيۡكُمۡ لَمُرۡسَلُونَ'' کہ بے شک ہم تمہاری طرف ضرور بھیجے گئے ہیں اور بلاغت کا یہ قاعدہ ہے کہ انکار کے وقت تاکید کے ساتھ کلام کیا جائے۔

﴿يَا حَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ مَا يَأۡتِيهِمۡ مِنۡ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسۡتَهۡزِئُونَ﴾[سورہ یس:۳۰]

ترجمہ: ہائے افسوس ان بندوں پر جب ان کے پاس کوئی رسول آتا ہے تو اس سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔

اعتراض: حسرت کرنا یا افسوس کرنا تو مخلوق کے ساتھ خاص ہے، اللہ

تبارک وتعالیٰ پر یہ محال ہے پھر اس میں اللہ پاک کی طرف حسرت کی نسبت کیوں کی گئی ہے؟

جواب: مذکورہ ارشاد باری تعالیٰ میں بندوں ہی کا اپنے اوپر حسرت و افسوس کرنا مراد ہے اور معنی یہ ہے کہ ہائے بندوں کا اپنے اوپر حسرت کرنا! اور یہ اس وقت ہوگا جب روز قیامت یہ لوگ اپنے سامنے عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تب خود پر افسوس کریں گے لیکن وہاں افسوس کرنا ان کو نفع نہ دے گا۔

﴿وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ﴾

[سورہ یس: ۴۱]

ترجمہ: اور ان کے لیے نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو بھری کشتی میں سوار کیا۔

اعتراض: اس مقام پر اہل مکہ سے خطاب ہے کہ ان کی ذریت یعنی اولاد کو کشتیٔ نوح میں سوار کیا لیکن جو کشتی میں سوار ہوئے وہ اہل مکہ کے آبا و اجداد میں شمار ہوں گے نہ کہ ذریت میں چونکہ ذریت تو اولاد کو کہتے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ بہت پہلے کا ہے۔

جواب: شیخ الاسلام ابو عثمان صابونی نے فرمایا کہ لفظ ذریت کا اطلاق ابنا اور آبا دونوں پر ہوتا ہے لہذا یہ لفظ بھی انہیں اسما میں سے ہے جو متضاد معنی دیتے ہیں لہذا یہاں لفظ ذریت آبا و اجداد کے معنی میں ہوگا اور کوئی اشکال وارد نہ ہوگا۔

۲۔ امام ماوردی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

یہاں ذریت سے مراد نطفہ ہے کہ اللہ پاک نے اس کو ماؤں کے شکم میں سوار کیا اور رکھا۔ یہاں ماؤں کو بھری ہوئی کشتی سے تشبیہ دی ہے۔

﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ﴾[سورہ یس: ٦٩]

ترجمہ: اور ہم نے ان کو شعر کہنا نہ سکھایا، اور نہ ان کی شان کے لائق ہے۔

اعتراض: قرآن کی اس آیت کریمہ میں تو کہا گیا کہ ہم نے حضور پاک کو شعر کہنا نہ سکھایا اور ان کے لیے یہ مناسب بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار کہے ہیں مثلاً:

آپ نے فرمایا:

أنا النبي لا كذب

أنا ابن عبد المطلب

ترجمہ: میں نبی ہوں، اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

ایک روایت میں یہ ہے۔

هل أنت إلا أصبع دميت

و في سبيل الله ما لقيت

ترجمہ: تو (اے انگلی) کیا ہے مگر ایک زخم کھانے والی انگلی! اور یہ (زخم) اللہ کی راہ میں جو کچھ تجھ پر آیا ہے وہی ہے۔

جواب: آیت کریمہ میں جو نفی وارد ہے اس سے وہ اشعار مراد ہیں جو جھوٹ اور باہمی خیالات پر مشتمل ہوتے ہیں جن کے متعلق اللہ پاک نے

ارشادفرمایا:

﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ﴾

[سورۃ الشعراء: ۲۲۴-۲۲۵] کہ شاعروں کی پیروی گمراہ کرتے ہیں کیا تم نے نہ دیکھا کہ وہ ہرنالے میں سرگرداں پھرتے ہیں۔

لہذا انہیں اشعار کے متعلق اللہ پاک نے فرمایا کہ اپنے محبوب کونہیں سکھایا اوران کی شان کے لائق بھی نہیں ہے۔

۲۔ یامراد یہ ہے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوشعر گوئی کا ملکہ نہ دیا اور نہ ہی قرآن کریم شعروشاعری والی کتاب ہے، بلکہ یہ اللہ پاک کا کلام ہے۔

تفسیر خازن میں ہے کہ کفار قریش کہتے تھے۔محمد شاعر ہیں! جو وہ قرآن کہتے ہیں وہ شعر ہے توان کفار کی تردید میں آیت کریمہ نازل ہوئی ہے۔

۳۔ایک قول یہ ہے کہ شعروہ ہے جوموزون و مقفی ہو،اورشعر کا قصد بھی کیا گیا ہولہذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواشعار کہے ہیں وہ موزون و مقفی تو ہیں لیکن ان سے شعر کا قصد نہیں کیا گیا ہے۔

بلکہ یہ اتفاق ہے جس طرح عام طور پر کلام میں یا نثر میں اتفاق سے وزن بن جاتا ہے اسی طرح ان مذکورہ اشعار میں بلا قصد وزن اور قافیہ پا لیا گیا ہے۔

سورة الصافات

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ﴾[سورة الصافات: ٨٨-٨٩]

ترجمہ: پھر اس نے ایک نگاہ ستاروں کو دیکھا، پھر کہا میں بیمار ہونے والا ہوں۔

اعتراض: حضرت ابراہیم علیہ السلام بیمار نہ تھے پھر آپ نے کیوں فرمایا کہ میں بیمار ہوں؟ جبکہ آپ نبی ہیں آپ سے اس طرح کا کلام کسی طرح درست نہ تھا۔

جواب: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہ فرمایا کہ میں بیمار ہوں بلکہ یوں فرمایا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں یعنی عنقریب بیمار ہو جاؤں گا اور یہ کذب نہیں تھا چونکہ آپ نے ستاروں کو دیکھ کر پتہ لگا لیا تھا کہ عنقریب آپ بیمار ہو جائیں گے۔

ابن انباری نے فرمایا: اللہ پاک نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو بتا دیا تھا کہ فلاں ستارہ جب فلاں جگہ سے طلوع ہوگا تو آپ بیمار ہو گے اس لیے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی جانب نظر کی اور ان کی گردش کو دیکھا تو جان لیا کہ آپ بیمار ہونے والے ہیں لہذا اسی لیے آپ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں۔

۲: یا معنی یہ ہے کہ میں قلبی طور پر بیمار ہوں جس کا سبب یہ ہے کہ تم ان

بتوں کی عبادت کرتے ہو، ان کے آگے سر جھکاتے ہو، جو کچھ بھی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں یہ سب دیکھ کر میں قلبی طور پر بیمار ہو چکا ہوں۔

﴿قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾

[الصافات:۱۰۵]

ترجمہ: بے شک (اے ابراہیم) تو نے خواب سچا کر دکھایا، ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو۔

اعتراض: خواب کو سچا کر دکھانا تب پایا جاتا جب آپ اپنے بیٹے کو حقیقی طور پر ذبح فرما دیتے، چوں کہ آپ نے خواب دیکھا تھا کہ آپ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح فرما رہے ہیں جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿قَالَ يَا بُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ﴾

[الصافات:۱۰۲]

ترجمہ: کہا اے میرے بیٹے! میں خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔

جواب: ۱۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے وہ تمام امور انجام دیے جو ایک ذبح کرنے والا انجام دیتا ہے، گلے پر چھری بھی چلائی لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے چھری کو ذبح کرنے سے منع کر دیا اور بیٹے کی جگہ پر مینڈھا ذبح کر کے ان کی قربانی قبول فرمائی۔

۲۔ایک قول یہ ہے کہ آپ نے خواب دیکھا کہ آپ ذبح کرنے کے امور انجام دے رہے تھے اور خون نہیں بہا رہے تھے پھر اس کے بعد آپ نے

حقیقی طور پر یہ کام کیا لہذا پھر آپ نے خواب کو حقیقی طور پر سچ کر دکھایا تھا۔

﴿وَاَرۡسَلۡنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلۡفٍ اَوۡ يَزِيۡدُوۡنَ ﴾[الصافات:۱۴۷]

ترجمہ: اور ہم نے اسے (یونس علیہ السلام) لاکھ آدمیوں کی طرف بھیجا یا اس سے زیادہ کی طرف۔

اعتراض: لاکھ آدمیوں کی طرف بھیجا یا اس سے زیادہ کی طرف یہاں شک کے ساتھ کیوں بیان کیا گیا؟ جب کہ یہ اللہ پاک کا قول ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے شک محال ہے کہ وہ عالم الغیب والشھادۃ ہے۔

جواب: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''او'' یہاں ''بل'' معنی میں ہے اور اس قوم کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تھی۔ (تفسیر طبری)

قرآن پاک میں اور مقامات میں بھی لفظ ''او'' ''بل'' کے معی میں مستعمل ہے۔

چناں چہ ارشاد باری ہے:

﴿فَكَانَ قَابَ قَوۡسَيۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى ﴾[النجم:۹]

ترجمہ: تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم۔

۲۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''او'' یہاں ''واؤ'' کے معنی میں ہے، اور آیت کریمہ کا معنی ہے کہ ایک لاکھ اور کچھ زیادہ۔

سورۃ ص

﴿قَالُوْا لَا تَخَفْ خَصْمَانِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ﴾[ص:۲۲]

ترجمہ: (فرشتے) بولے ڈرومت ہم دوفریق ہیں کہ ایک نے دوسرے پرزیادتی کی ہےتو ہم میں سچا فیصلہ فرمادیجئے۔

اعتراض: فرشتوں کی جانب سرکشی اورزیادتی کی نسبت کرنا کس طور پر درست ہوسکتا ہے حالانکہ وہ معصوم ہیں ان سے کسی بھی قسم کا گناہ ممکن نہیں ہے۔

جواب: آیت مذکورہ میں ایک مفروضہ صورت کو بیان کیا گیا ہے ان فرشتوں نے کوئی سرکشی یا زیادتی نہ کی تھی کہ ان کی عصمت پر اشکال وارد ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی مسئلہ فرض کیا جائے جس طرح کتب فقہ میں مسائل ذکر کیے جاتے ہیں کہ ایک شخص کے چالیس بکریاں ہوں اوردوسرے شخص کی اسّی تو پہلے پرایک بکری زکوٰۃ ہوگی اوردوسرے پردو۔

یہ دونوں شخص سامنے ہوں اورکسی کے پاس کوئی بکری نہ ہو پھربھی یہ جھوٹ نہ ہوگا چونکہ یہ ایک صورت مفروضہ تھی اسی طرح وہ دونوں فرشتے ایک مسئلہ مفروضہ لے کر گئے تھے۔لہذا اس میں نہ فرشتوں کی جانب سے کوئی زیادتی ہوئی اورنہ ہی ایک دوسرے میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا ہوا۔

﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ

بَعْدِیْ﴾[ص:۳۵]

ترجمہ: (سلیمان نے) عرض کی اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا کرکہ میرے بعد کسی کو لائق نہ ہو۔

اعتراض: حضرت سلیمان علیہ السلام ایک نبی ہیں ان کے لیے اس طرح کی دعا کرنا کہ مجھے ایسی بادشاہت دے جو کسی کو لائق نہ ہو، آپ کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اول تو بادشاہت طلب کرنا، دوم ایسی بادشاہت جو کسی کے لائق نہ ہو، اس میں طلب دنیا بھی ہے اور حسد بھی ہے۔

جواب: حضرت قتادہ نے فرمایا: اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ مجھے ایسی سلطنت عطا فرما کہ کوئی مجھ سے میری زندگی میں سلب نہ کر سکے جس طرح شیطان نے سلب کرنے کی کوشش کی تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی پہن کر آپ کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

۲۔ اللہ تبارک وتعالیٰ علیم وخبیر ہے اس کو معلوم تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے علاوہ کوئی اس مملکت وسلطنت کو نہیں چلا سکتا اس لیے حکمت باری تعالیٰ یہ ہوئی کہ ان کو اس کے لیے خاص فرمالیا اور پھر ان پر وحی فرمائی کہ اس طرح دعا کریں تا کہ اس سلطنت کو آپ کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔

﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾[سورۃ زمر:٦]

ترجمہ: اس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا، اور تمہارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے نازل کیے۔

اعتراض: اس آیت مبارکہ میں دو اعتراض ہیں۔

اول: اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا پھر ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا فرمایا۔ اس کے بعد ان دونوں سے ساری مخلوق کو پیدا فرمایا لیکن مذکورہ آیت کریمہ میں ہے پہلے اولاد آدم کو پیدا فریا پھر حضرت حوا کو پیدا فرمایا اور اس پر لفظ **ثُمَّ** دلالت کر رہا ہے کہ **ثُمَّ** ترتیب مع التراخی کے لیے آتا ہے۔

دوم: اللہ پاک نے تمام چوپایوں کو زمین میں پیدا فرمایا ہے کسی کو آسمان سے نازل نہ فرمایا لیکن آیت کریمہ میں بتایا کہ چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے آسمان سے نازل فرمائے ہیں۔

جواب:

اول: ا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر ذرہ کی شکل میں ان کی پیٹھ سے تمام ذریت کو نکالا اور عہد و میثاق لینے کے بعد واپس کر دیا اس کے بعد ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا فرمایا ہے لہذا اس آیت مبارکہ میں اسی جانب اشارہ ہے۔

۲۔ ایک قول یہ ہے کہ "**ثُمَّ**" ترتیب فی الایجاد کے لیے آتا ہے اور کبھی کبھی صرف ترتیب فی الاخبار کے لیے آتا ہے یعنی اس سے مقصود صرف خبر دینا رہتا ہے اور ترتیب ملحوظ نہیں ہوتی ہے مذکورہ آیت مقدسہ میں یہی ترتیب فی الاخبار مراد ہے۔

اس کی تائید حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے شعر سے ہوتی ہے چناں چہ آپ فرماتے ہیں۔

اِنَّ مَنْ ساد ثم ساد ابوه
ثم ساد قبل ذلك جده

ترجمہ: یقیناً جس نے خود سرداری کی پھر اس کے والد نے سرداری کی اور پھر اس سے پہلے اس کے دادا سردار تھے۔

یہاں ثم صرف ترتیب فی الاخبار کے لیے ہے ورنہ تو لازم آئے گا کہ پہلے بیٹے نے سرداری کی اس کے بعد باپ سردار بنے اور اس کے بعد میں دادا سردار بنے حالانکہ یہ مقصود نہیں ہے۔

دوم: ا۔ دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے چوپایوں کے وہ آٹھ جوڑے جنت میں پیدا فرمائے پھر حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر آنے کے بعد ان کو زمین پر اتارا۔

۲۔ چوپایوں کو آسمان سے نازل نہ فرمایا بلکہ یہاں بلاغت کا قاعدہ مجاز مرسل کا استعمال کیا گیا ہے بایں طور کہ اللہ پاک نے آسمان سے پانی نازل فرمایا کہ چوپایوں کی زندگی کے لیے سبب ہے چونکہ بنا پانی کے چوپائے زندہ نہیں رہ سکتے ہیں لہذا چوپائے مسبب ہوئے اور پانی سبب پس یہاں مجاز ل مرسل ہے اور علاقہ مسببیت کا پایا جا رہا ہے۔

سورۂ مومن میں ہے:

﴿وَيُنَزِّلُ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ رِزْقًا﴾[المؤمن:۱۳]

اس آیت کریمہ میں ہے کہ اللہ پاک آسمان سے رزق نازل فرماتا ہے حالانکہ رزق آسمان سے نہیں اترتا ہے بلکہ آسمان سے پانی اترتا ہے، جو رزق کا سبب بنتا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورۃ المؤمن

﴿مَا يُجَادِلُ فِيٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ﴾[المؤمن:۴]

ترجمہ: اللہ کی آیتوں میں کافر ہی جھگڑا کرتے ہیں۔

اعتراض: آیتوں میں مومنین بھی اختلاف اور جدال کرتے ہیں۔ خصوصاً اہل علم کہ یہ آیت ناسخ ہے یا منسوخ، اس سے یہ معنی مراد ہے، یا دوسرا معنی، پھر یہاں کیوں کہا گیا کہ اللہ کی آیتوں میں صرف کافر ہی جھگڑا کرتے ہیں۔

جواب: یہاں جدال سے وہ اختلاف اور جدال مراد نہیں ہے جو علما اور مفسرین کے مابین ہوتا ہے بلکہ یہاں جدال سے تکذیب اور قرآن پاک کی آیتوں میں طعن وتشنیع کرنا مراد ہے، رہا علمائے کرام کا آیات قرآنیہ کی تفسیر میں اختلاف کرنا تو یہ برا نہیں بلکہ محبوب اور رحمت ہے کہ اس کے ذریعہ سے امت کے لیے وسعت پیدا ہوتی ہے۔

سورۃ الشوری

﴿ لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞ ﴾[الشوری: ۱۱]

ترجمہ: اس جیسا کوئی نہیں۔

اعتراض: مذکورہ آیت کریمہ میں اللہ رب العزت کے لیے مثل ثابت کیا گیا پھر اس مثل کے مثل کی نفی کی گئی ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ لیس ککتاب زید کتاب کہ زید کی کتاب کی طرح کوئی کتاب نہیں ہے تو زید کے لیے کتاب کا ثبوت ہوا پھر اس کتاب کے مثل کی نفی کی گئی ہے، اسی طرح اللہ رب العزت کے لیے مثل ثابت کیا گیا پھر اس مثل کے مثل کی نفی کی گئی ہے۔

جواب: آیت مذکورہ میں کاف زائد ہے صرف تاکید کے لیے لایا گیا ہے لہذا یہ اشکال واعتراض وارد نہ ہوگا۔

۲۔ اہل عرب کے نزدیک لفظ مثل کا اطلاق ذات پر بھی ہوتا ہے چوں کہ یہ ذات سے کنایہ ہے اب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کی ذات کی طرح کوئی شی نہیں ہے۔

۳۔ ایک قول یہ ہے کہ لفظ مثل زائد ہے تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ اور اصل عبارت ''لَيۡسَ هو کشیء'' ہے۔

سورہ محمد

﴿وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ﴾[محمد:۵-۴]

ترجمہ: اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے اللہ ہرگز ان کے اعمال ضائع نہ فرمائے گا جلد ہی انہیں ہدایت دے گا۔

اعتراض: ہدایت اور گمراہی تو موت سے پہلے ہوتی ہے موت کے بعد متصور نہیں ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے شہدا کے بارے میں فرمایا کہ موت کے بعد ان کو ہدایت دے گا۔

جواب: اس آیت کریمہ کا محل یہ ہے کہ جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے اللہ پاک ان کو روز قیامت جنت کی طرف راہ دے گا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں قبر میں منکر نکیر کے سوالات کے جواب میں ہدایت پر رکھے گا اور قبر میں ان کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے گا۔

۲۔اس آیت کا دوسرا محل یہ ہے اللہ پاک انہیں جنت کی ایسی معرفت اور پہچان کرادے گا کہ وہ بنا غور وفکر اور سوچ بچار کے جنت میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ رب العزت نے دنیا میں ہی ان کو جنت کے مقامات کی اس طرح پہچان کرادی ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوں گے تو ان نشانیوں کی وجہ سے جنت میں اپنا ٹھکانہ پہچان لیں گے۔

سورۃ الفتح

﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾[الفتح:۲]

ترجمہ: تاکہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔

اعتراض: انبیائے کرام تو گناہوں سے معصوم ہوا کرتے ہیں پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کونسے گناہوں کے بارے میں خطاب فرما رہا ہے کہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔

جواب: ا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اتمام نعمت کا ذکر فرمایا، اور اتمامِ نعمت کا حصہ یہ بھی ہے کہ آپ کے خلاف اولیٰ امور کی مغفرت فرما دے، چونکہ خلاف اولیٰ امور کا صدور انبیائے کرام سے علما نے جائز کہا ہے کہ انبیا سے خلاف اولیٰ کا صدور ہوسکتا ہے۔

۲۔ ''**یغفر**'' میں لام علت کے لیے ہے اور ذنب کی نسبت اگرچہ حضور پاک کی طرف کی ہے لیکن آپ کی امت کے گناہ مراد ہیں لہذا اب آیت کریمہ کے معنی یہ ہوگا: تاکہ اللہ پاک آپ کے سبب آپ کی امت کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف فرما دیے، امام اہل سنت سرکار اعلی حضرت امام احمد رضا خان نے اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے اور اسی کے مطابق اس آیت کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورہ ق

﴿اِذۡ یَتَلَقَّی الۡمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ﴾
[ق:۱۷]

ترجمہ: جب اس سے لیتے ہیں دو لینے والے، ایک داہنے بیٹھا اور ایک بائیں۔

اعتراض: یہاں دو فرشتوں کے بیٹھنے کا ذکر ہے، ایک فرشتہ انسان کے داہنے جانب ہے اور دوسرا انسان کے بائیں جانب جب دو فرشتے ہیں تو لفظ قعیدان تثنیہ کا صیغہ لانا چاہیے تھا، واحد کا صیغہ ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ۱۔ قعید فعیل کا صیغہ ہے اس میں واحد، تثنیہ اور جمع کی کوئی رعایت نہیں ہوتی ہے۔ فعیل کا صیغہ واحد، تثنیہ اور جمع سب کے لیے یکساں مستعمل ہے، اور اس کا اطلاق سب پر حسب موقع ہوا کرتا ہے۔

۲۔ اس مقام پر ایک قعید محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے۔ ''عن الیمین قعید وعن الشمال قعید'' کہ ایک فرشتہ دائیں جانب بیٹھا ہے اور ایک بائیں جانب بیٹھا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورة الذاريات

﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴾[الذاریات:۵]

ترجمہ: بے شک جس بات کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے ضرور سچا ہے۔

اعتراض: یہاں صادق کی جگہ صدق مصدر ہونا چاہیے چوں کہ صادق قائل کی صفت ہے۔اور وعدہ کی صفت صدق آتی ہے۔

جواب: یہاں صادق صدق کے معنی میں ہی ہے چوں کہ کبھی کبھی مصدر فاعل کے وزن پر بھی آجاتا ہے مثلاً قمت قائما ، لحقت بهم لائمة ۔أي اللوم"

یا لفظ صادق اسم مفعول مصدوق کے معنی میں ہے اس لیے کہ فاعل، اسم مفعول کے معنی میں بھی مستعمل ہے مثلاً ''عيشة راضية۔أي مرضية اور''ماء دافق''ای مدفوق.

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾
[الذاریات: ۴۹]

ترجمہ: اور ہم نے ہر چیز کی دو قسمیں بنائیں تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

اعتراض: بہت سی چیزوں کا جوڑا اللہ پاک نے پیدا فرمایا، لیکن کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں کہ اس کا جوڑا نہیں بنایا ہے مثلاً: عرش، کرسی، لوح وقلم وغیرہ ۔پھر آیت کریمہ میں کیوں حصر کے ساتھ فرمایا کہ ہر چیز کا جوڑا پیدا فرمایا ہے۔

جواب: اس سے مراد یہ ہے کہ ہر حیوان کے نر اور مادہ جوڑے بنائے ہیں، ہم حیوانات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر

حیوان کا جوڑا پیدا فرمایا ہے۔

یا آیت سے مراد وہ اشیا ہیں، جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں پس ان تمام کے جوڑے بنائے ہیں مثلاً: رات و دن، موت و زندگی، زمین و آسمان، چاند و سورج وغیرہ۔

سورۃالنجم

﴿اَفَرَءَيۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰى، وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الۡاُخۡرٰى﴾
[النجم: ۱۹-۲۰]

ترجمہ: تو کیا تم نے دیکھا لات اور عزی کو اور تیسری منات کو۔

اعتراض: منات جو کہ تیسرے نمبر پر ہے اس کو اخریٰ کی صفت سے موصوف کیا جبکہ جو چیز دوسرے نمبر پر ہوتی ہے اس کو آخری کی صفت سے موصوف کیا جاتا ہے۔

جواب: درحقیقت لفظ اخری یہ عزی کی صفت ہے لیکن رعایت فواصل کے سبب اس کو آخر میں لائے ہیں۔ اصل عبارت یوں ہے۔

''اَفَرَاَيۡتُمُ اللَّاتَ وَالۡعُزّٰى الۡاُخۡرٰى وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ''

﴿وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ [النجم: ۳۹]

ترجمہ: اور یہ کہ آدمی نہ پائے گا مگر اپنی کوشش کا۔

اعتراض: آیت مبارکہ تو یہ کہتی ہے کہ انسان اپنا کیا ہی پائے گا لیکن حدیثوں سے اور آثار صحابہ سے ثابت ہے کہ بندہ دوسروں کو بھی ثواب پہنچا سکتا ہے مثلاً اس کی جانب سے صدقہ کرے، حج کر آئے یا قرآن پڑھ کر بخش دے تو بعد موت بھی دوسروں کو ثواب پہنچتا ہے۔

جواب: مذکورہ آیت مبارکہ صحف ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا مضمون ہے اور ممکن ہے کہ ان کی شریعت میں ایسا رہا ہو، لیکن شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ حکم نہیں ہے۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ حکم ہماری شریعت میں سورہ طور کی آیت ''**الحقنا بھم ذریتھم**'' سے منسوخ ہو گیا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہاں انسان سے مراد کافر ہے اور اس کو کسی قسم کا کوئی اجر وثواب نہیں پہنچتا ہے رہا بندۂ مومن تو اس کو بعد موت بھی اجر وثواب پہنچتا ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : " إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ "(صحیح مسلم: رقم الحدیث: ۱۶۳۱)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے ان تین اعمال کے۔

۱۔صدقہ جاریہ۔

۲۔وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

۳۔نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔

سورة القمر

﴿كَاَنَّـهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ﴾[القمر:٢٠]

ترجمہ: گویا کہ اکھڑی ہوئی کھجور کے سوکھے تنے ہیں۔

اعتراض: نخل تو ''نخلة'' کی جمع ہے اور ''نخلة'' مؤنث ہے، اس لحاظ سے اس کی صفت بھی **منقعرة** مونث آنی چاہیے تھی، جیسا کہ دوسرے مقام پر اس کی صفت مؤنث ذکر کی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ حاقہ میں ہے:

﴿كَأَنَّهُمۡ أَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ﴾[الحاقة:٧]

جواب: ا۔ امام ابوعبیدہ کا کہنا ہے کہ لفظ نخل میں مذکر و مؤنث دونوں لغت ہیں۔ اور اسی لیے قرآن پاک میں دونوں طرح استعمال بھی ہوا ہے۔

۲۔ لفظ نخل لفظاً مذکر ہے اور معنیً جمع ہے لہذا جہاں نخل کی صفت مذکر ذکر کی وہاں لفظ کی رعایت کی گئی ہے اور جہاں صفت مؤنث ذکر کی گئی ہے وہاں معنی کی رعایت کی گئی ہے۔

سورۃ الواقعة

﴿فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ﴾[الواقعة:٧٤]

ترجمہ: تو اے محبوب! تم پاکی بولو عظمت والے رب کے نام کی۔

اعتراض: تسبیح کے معنی ہیں کہ اللہ رب العزت کو تمام عیوب ونقائص سے منزہ ماننا اس لحاظ سے ''فَسَبِّحۡ بِرَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ'' یعنی اپنے عظمت والے رب کی پاکی بولو ہونا چاہیے۔ لیکن اس میں کہا گیا کہ رب کے نام کی پاکی بولو، اس میں کیا حکمت ہے؟۔

جواب: ا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں ''با'' زائدہ ہے اور لفظ اسم ذات کے معنی میں ہے اس اعتبار سے آیت کا یہی معنی ہے کہ اے محبوب! اپنے عظمت والے رب کی ذات کی پاکی بیان کرو۔

۲۔ لفظ اسم یہاں ذکر کے معنی میں ہے لہذا معنی ہوا کہ اپنے رب کا ذکر کر کے اس کی پاکی بیان کرو۔

ضحاک کا کہنا ہے کہ تسبیح سے مراد نماز ہے اور آیت کے معنی ہے کہ نماز کو اللہ کے نام سے یعنی تکبیر کے ذریعہ شروع کرو۔

سورۃ الحدید

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۙ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾[الحدید:۸]

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا کہ اللہ پر ایمان نہ لاؤ، حالانکہ رسول تمہیں بلا رہے ہیں کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ اور بے شک وہ تم سے پہلے عہد لے چکا ہے اگر تم مومن ہو۔

اعتراض: یہاں ایمان لانے کا حکم بھی دیا جا رہا ہے اور بعد میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر تم مومن ہو، آیت کا پہلا جز بتا رہا ہے کہ وہ فی الحال مومن نہ تھے اسی لیے ایمان لانے کو کہا جا رہا ہے جبکہ ''اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ'' کا جملہ صراحت کر رہا ہے کہ وہ فی الحال بھی مومن تھے۔

جواب: ۱۔ تفسیر طبری میں ہے کہ'' اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ''میں ایمان سے پہلے ارادہ محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے کہ'' اِنۡ كُنۡتُمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تُوۡ مِنُوۡا بِاللهِ '' اگر تم اللہ پر ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہو، تو یہ وقت بہتر ہے ایمان لانے کے لیے کہ رسول کی دعوت آ پہنچی ہے قرائن ودلائل بھی ثابت ہو چکے ہیں پھر کس بات کی دیری ہے؟

۲۔ یا یہ مطلب ہے کہ اے لوگو! اگر تم دین موسیٰ اور دینِ عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان رکھتے ہو تو ان کی شریعت کا بھی تقاضہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔

۳۔ایک قول یہ ہے کہ اے لوگو! اگر تم میثاق پر ایمان و یقین رکھتے ہو جو عہد و پیمان ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ''[الاعراف: ۱۷۲] کے ذریعہ لیا گیا تھا تو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کیوں نہیں لاتے ہو اور ان پر ایمان لانے سے کونسی چیز مانع ہے؟ جبکہ وہ رسول تمہیں ایمان کی طرف بلا رہے ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ﴾[الحديد: ۱۹]

ترجمہ: اور وہ جو اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لائے وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور گواہ ہیں۔

اعتراض: بیان کیا جاتا ہے کہ نبی کے بعد سب سے بڑا درجہ صدیقین کا ہوتا ہے پھر اس کے بعد دیگر مرتبے ہوتے ہیں لیکن آیت مذکورہ میں بتایا کہ ہر مومن صدیق اور شہید ہے۔

جواب: ۱۔ ضحاک نے فرمایا کہ یہاں مطلقا ہر مومن مراد نہیں ہے بلکہ آٹھ اجلۂ صحابہ کرام کا گروہ مراد ہے وہ یہ ہے:

حضرت ابو بکر صدیق، حضرت مولیٰ علی، حضرت زید، حضرت عثمان غنی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اور بشمولِ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یہ نو صحابہ کرام کی جماعت ہو گئی یہی اس آیت کریمہ سے مراد ہیں۔

۲۔ اگر یہ کہا جائے کہ صدیق وہ ہے جو صدق و صداقت میں مشہور ہو، اپنے تمام افعال و اقوال میں سچ بولنے میں معروف ہو، تب اس آیت میں کل بول کر جزء مراد ہوگا، لہٰذا تمام مومن مراد نہیں ہیں بلکہ بعض مومن مراد ہوں گے۔

اور اگر کوئی لفظ شہدا سے اعتراض کرے کہ سب راہِ خدا میں قتل کیے نہیں گئے تو پھر شہید کیسے ہوئے؟ چونکہ شہید وہ ہے جو جنگ میں شہید کیا جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں شہدا کے برابر اجر وثواب مراد ہے کہ ان لوگوں کو شہدا کا اجر ملے گا۔

یا شہدا یہاں گواہ کے معنی میں ہے تب معنی یہ ہوگا کہ یہ لوگ روز قیامت اللہ کے نزدیک اپنے ایمان کے گواہ ہوں گے۔

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾[الحدید:۲۵]

ترجمہ: بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

اعتراض: اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتاب تو نازل فرمائی لیکن آسمان سے ترازو نہیں اتاری، پھر یہاں ترازو اتارنے کا ذکر کیوں ہے؟

جواب: حضرت مجاہد نے فرمایا: میزان سے مراد عدل ہے کہ اللہ پاک نے انبیائے کرام کو عدل وانصاف کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اور قتادہ کا کہنا ہے: میزان سے مراد حق ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاو رسل کو حق لے کر بھیجا ہے۔

۲۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں میزان سے وہی معروف ترازو مراد ہے اور اس سے مراد وہ ترازو ہے جسے حضرت جبرئیل امیں آسمان سے لے کر نازل ہوئے اور حضرت نوح علیہ السلام کو دیا اور کہا کہ اے نوح! اپنی قوم کو حکم دو کہ اس کے ذریعہ اشیا کا وزن کیا کریں۔

❁❁❁❁❁

سورة الجمعة

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾[الجمعة: ۹]

ترجمہ: اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کی اذان ہو تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔

اعتراض: نماز کے لیے دوڑنے سے منع فرمایا گیا ہے یہاں تک کہ اگر جماعت قائم ہو چکی ہو پھر بھی نماز کے لیے دوڑنا روا نہیں ہے، لیکن اس آیت میں حکم ہے کہ جب جمعہ کی اذان ہو جائے تو نماز کے لیے دوڑو۔

جواب: مذکورہ آیت کریمہ میں دوڑنے سے قدموں سے دوڑنا مراد نہیں ہے بلکہ نماز جمعہ کے لیے اور خطبۂ جمعہ کے لیے تیاری کرنے میں جلدی کرنا مراد ہے۔

اکثر مفسرین نے ذکر اللہ سے خطبۂ جمعہ مراد لیا ہے۔

یہاں قدموں سے دوڑ کر جانا مراد نہیں ہے چوں کہ اس کی ممانعت حدیث پاک میں وارد ہے، بخاری و مسلم کی حدیث پاک ہے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اقامت کی آواز سنو تو نماز کے لیے نکلو، اور تم پر لازم ہے کہ اطمینان وسکون اور وقار کے ساتھ نکلو، اور دوڑ کر مت جاؤ، اب جتنی نماز پاؤ، اسے امام کے پیچھے ادا کرو اور جو فوت ہو جائے اس کو بعد میں مکمل کرو۔ (صحیح مسلم: رقم الحدیث: ۸۵۶)

❁❁❁❁❁

سورۃ الطلاق

﴿وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾[سورۃ الطلاق:٦]

ترجمہ: اور اگر وہ (عورتیں) حمل والیاں ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ بچہ جن دیں۔

اعتراض: اگر مطلقہ حاملہ نہیں ہے تب بھی شوہر پر عدت کے گزرنے تک نفقہ لازم ہے پھر یہاں حمل کی قید کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: حاملہ عورت کے حمل کی مدت اگر طول پکڑ جائے اور مدت طلاق بائنہ سے زیادہ آگے بڑھ جائے تو کہیں کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ طلاق کی مدت تو تین حیض یا تین ماہ ہے اب وہ حمل والی عورت کا نفقہ دینا بند کر دے اس لیے یہاں صراحت کر دی گئی ہے کہ حمل والی عورتوں کا نفقہ مدت حمل تک ہے جب تک وضع حمل نہ ہو جائے شوہر نفقہ منقطع نہیں کر سکتا ہے اگر چہ سال کیوں نہ گزر جائے لہذا ''حَتّٰی یَضَعْنَ حَمْلَھُنَّ'' کے ذریعہ اسی وہم کو دور کیا گیا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورة التحريم

﴿إِن تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ﴾ [سورة التحریم:۴]

ترجمہ: (اے نبی کی دونوں بیویو!) اگر تم اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو کیونکہ تمہارے دل ضرور کچھ ہٹ گئے ہیں (تو وہ توبہ قبول فرمائے گا) اور اگر نبی کے مقابلہ میں تم ایک دوسرے کی مدد کرو تو بے شک اللہ خود ان کا مددگار رہے اور جبرئیل اور نیک ایمان والے اور اس کے بعد فرشتے مددگار رہیں۔

اعتراض: آیت مذکورہ میں صالح المومنین سے کون مراد ہیں؟ کیا کوئی فرد واحد مراد ہے اگر ہے تو وہ کون ہے؟ یا اس سے کوئی جماعت یا گروہ مراد ہے تب لفظ صالح کو واحد کیوں ذکر کیا جبکہ واو جمع کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تھا۔

جواب: ا۔ یہاں لفظ صالح مفرد ذکر کیا ہے لیکن اسم جنس کے طور پر اس سے جماعت مراد ہے جس طرح ''اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ'' [سورۃ العصر:۲] میں انسان سے جنس انسان مراد ہے۔

۲۔اس سے مراد ایک گروہ ہو اور لفظ صالح کو مفرد ذکر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ یہ جمع ہی ہو لیکن خط عثمانی میں بنا واو کے لکھا گیا ہو جس طرح اور بہت سے الفاظ خط عثمانی میں علاحدہ طریقہ سے مرقوم ہیں۔

۲۔ایک قول کے مطابق اس سے مراد حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما ہیں اور حضرت حسن بصری نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ

عنہ کا بھی اضافہ کیا ہے اور مجاہد نے فرمایا: صالح المومنین سے مراد حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

فائدہ: بخاری و مسلم کی حدیث پاک ہے:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بات کی عرصہ سے خواہش تھی کہ میں امیر المومنین حضرت عمر فاروق بن خطاب رضی اللہ عنہ سے پوچھوں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے وہ کونسی دو بیبیاں تھیں جن کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَی اللّٰہِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُکُمَا''

فرماتے ہیں کہ حتیٰ کہ میں نے حضرت عمر فاروق کے ساتھ حج کا شرف حاصل کیا۔ تو آپ راستے میں ایک طرف ہو لیے تو میں بھی آپ کے ہمراہ ہولیا، جب آپ فارغ ہو کر واپس آئے تو میں نے وضو کے لیے لوٹے سے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈالا اور عرض کی: اے امیر المومنین! ازواج مطہرات سے وہ کون سی دو بیبیاں تھیں جن کے بارے میں اللہ پاک نے ''ان تتوبا'' الخ ، ارشاد فرمایا۔ آپ نے فرمایا: ابن عباس تم پر تعجب ہے؟ وہ دو بیبیاں حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما تھیں۔

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ [سورة التحریم:۸]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی طرف ایسی توبہ کرو جس کے بعد گناہ کی طرف لوٹنا نہ ہو۔

اعتراض: لفظ توبہ مؤنث ہے اس لحاظ سے اس کی صفت بھی ”نصوحۃ“ مؤنث ہی لانی چاہیے تھی پھر مذکر کیوں ذکر کی؟

جواب: اس لیے کہ فعول کا صیغہ مبالغہ کے اوزان سے ہے اور اس کا استعمال مذکر و مؤنث سب کے لیے یکساں ہے اور نصوح بھی فعول کے وزن پر ہے، لہذا یہ بھی سب کے لیے یکساں استعمال ہوگا۔ اسی طرح صبور شکور وغیرہ بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے۔:

رجل صبور امرأۃ صبور

رجل شکور امراۃ شکور

❁❁❁❁❁

سورة الملك

﴿أَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ﴾[سورۃ الملک:۱۶]

ترجمہ: تو کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے جو آسمان میں ہے اس بات میں کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے تو وہ زمین اچانک کانپنے لگے۔

اعتراض: اس سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے لیکن آسمان سے مقید کیوں کیا گیا کہ وہ آسمان میں ہے حالانکہ اللہ پاک تو جہت ومکان سے پاک ہے۔

جواب: ۱۔ یہاں بادشاہت مراد ہے کہ جس کی بادشاہت وسلطنت آسمان میں ہے کہ وہاں عرش وکرسی ہے، لوح محفوظ ہے، اللہ رب العزت کی خاص تجلیات کا مرکز بھی ہے۔

۲۔ یا من فی السماء سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کیوں کہ وہی عذاب کے امور کو انجام دیتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

۳۔ یا پھر کفار کے اعتقاد کے مطابق یہاں خطاب کیا گیا ہے چوں کہ کفار یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ پاک آسمان میں ہے لہذا قرآن مقدس نے انہیں کے اعتقاد کے مطابق کلام فرمایا ان کے تقریب فہم کے لیے۔

❁❁❁❁❁

سورۃ الحاقۃ

﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ﴾ [سورۃ الحاقۃ:۴]

ترجمہ: اور رہے عاد کے لوگ تو وہ نہایت سخت گرجتی آندھی سے ہلاک کیے گئے۔

اعتراض: لفظ صرصر صفت ہے ریح کی اور لفظ ریح مؤنث ہے تب صرصرۃ تائے تانیث کے ساتھ مؤنث آنا چاہیے کہ موصوف وصفت میں مطابقت ہوجائے۔

جواب: لفظ ''صرصر'' ریح کی صفت خاص ہے اس کے ذریعہ غیر کو موصوف نہیں کیا جاتا ہے، اب اس کا معاملہ حائض، طامث اور حامل کی طرح ہے کہ یہ الفاظ جس طرح مؤنث کے ساتھ خاص ہیں تو تائے تانیث ذکر کرنے کی حاجت نہیں ہے اسی طرح لفظ ''صرصر'' بھی ہے۔

﴿اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِيَهۡ﴾ [سورۃ الحاقۃ:۲۰]

ترجمہ: بے شک مجھے گمان تھا کہ میں اپنے حساب کو ملنے والا ہوں۔

اعتراض: یہ تو ایک امر یقینی ہے اور سب کا اس پر ایمان ہے کہ روز قیامت سب کا حساب ہوگا اور ان کو ان کے نامہ اعمال دیئے جائیں گے تب مذکور آیت میں ظن وگمان کے ذریعہ بیان کرنے کا کیا معنی ہے؟

جواب: ظن کبھی یقین کے معنی میں بھی آتا ہے، اور قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ظن یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے، انہیں میں سے یہ بھی ہے۔

اور مثلاً: سورۂ بقرہ میں ہے۔﴿ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾[البقرة:٤٦]

ترجمہ: جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا :﴿وَ اِنِّي لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا﴾[بني اسرائيل:١٠٢]

ترجمہ: اور بے شک مجھے یقین ہے اے فرعون ! تو ضرور ہلاک ہونے والا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورہ نوح

﴿يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[نوح:۴]

ترجمہ: وہ (اللہ) تمہارے کچھ گناہ بخش دے گا اور ایک مقررہ مدت تک تمہیں مہلت دے گا، بے شک اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدت جب آجائے تو اسے پیچھے نہیں کیا جاتا، کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم جانتے۔

اعتراض: آیت مذکورہ کے جز اول میں مقررہ مدت تک مہلت دینے سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ مراد ہے کہ جو ازل میں مدت مقرر ہے اس میں تاخیر کرنا تب یہ محال ہے کیوں اگلا جز صاف بتارہا ہے کہ ''اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ'' کہ یقیناً جب اللہ کی مقررہ مدت (جو ازل میں ہے) آجائے تو اسے پیچھے نہیں کیا جاتا۔ لہذا یہ محال ہوا اور اگر مہلت سے مراد یہ ہے جو مدت ازل میں لکھی ہے اس مدت تک مہلت دینا تب اس میں ان کی کیا تخصیص اس میں تو سب برابر ہیں۔

جواب: اختصاراً جواب یہ ہے: تقدیر کی دو قسمیں ہیں۔

تقدیر مبرم اور تقدیر معلق، آیت کریمہ کے دوسرے جز میں جو ذکر ہے کہ اللہ پاک کی مقررہ مدت بدلتی نہیں ہے تو اس سے تقدیر مبرم مراد ہے کہ وہ کسی صورت میں بدلتی نہیں ہے۔

اور جز اول میں تقدیر معلق مراد ہے۔ اور معلق کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پاک

نے کسی کام کو دوسرے کام پر موقوف کر کے لوح محفوظ میں لکھ دیا مثلاً اگر تمام قوم نوح علیہ السلام پر ایمان لے آئے تو ان پر طوفان کا عذاب نہ آئے گا اب اگر پھر تمام قوم ایمان نہ لائے تو ان پر عذاب آنا ہے لیکن واضح رہے کہ توقف بندوں کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہے اور اللہ پاک کو تو سب معلوم ہے کہ بندہ کیا کرے گا اور اس کا انجام ونتیجہ کیا ہوگا۔

آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے عذاب میں تاخیر فرمائے گا حتیٰ کہ ان کو دنیا میں عذاب نہ دے اس شرط پر کہ وہ ایمان لے آئیں۔

❁❁❁❁❁

سورۃ الدھر

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ [سورۃالدھر: ۲]

ترجمہ: بے شک ہم نے آدمی کو ملی ہوئی مٹی سے پیدا کیا کہ اسے جانچیں تو سنتا دیکھتا کر دیا۔

اعتراض: لفظ ''امشاج'' مشج کی جمع ہے یہ ''نطفة'' کی صفت ہے اس اعتبار سے لفظ نطفہ کو جمع لانا چاہیے کہ موصوف وصفت میں مطابقت ہو جائے یہاں موصوف کو واحد اور صفت کو جمع کیوں ذکر کیا ہے؟

جواب: لفظ امشاج میں اختلاف ہے کہ یہ جمع کا صیغہ ہے یا واحد کا۔ صاحب کشاف علامہ زمخشری کا کہنا ہے کہ امشاج واحد کا صیغہ ہے لہذا اس قول کو لیں تو اشکال ہی وارد نہ ہوگا کہ مطابقت پائی گئی ہے۔

لیکن فرا، ابن سکّیت، اور مبرد کا کہنا ہے کہ یہ مشج کی جمع ہے چنانچہ جمع ماننے کی صورت میں اس کی تاویل یہ ہوگی نطفہ سے اس کے ذرات اور اجزاء مراد ہیں، اب موصوف وصفت میں مطابقت ہو جائے گی۔

﴿نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ﴾ [سورۃالدھر:۲۸]

ترجمہ: ہم نے انہیں پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے۔

اعتراض: اس آیت میں ہے کہ اللہ پاک نے انسان کو مضبوط بنایا ہے اور دوسرے مقام پر ہے: خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا [سورۃ النساء:۲۸] کہ

انسان کمزور پیدا کیا گیا۔اب دونوں آیتوں میں تعارض ہو گیا۔

جواب: مفسرین فرماتے ہیں کہ ضعیف سے مراد یہ ہے کہ انسان عورتوں پر صبر وتحمل سے کام نہیں لے پاتا ہے بلکہ خواہش نفس اور شہوت اس پر غالب آجاتی ہے اسی لیے اسے کمزور کہا گیا ہے۔

❁❁❁❁❁

سورۃ التکویر

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ، بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ﴾[سورۃ التکویر: ۹-۸]

ترجمہ: اور جب زندہ دبائی ہوئی سے پوچھا جائے، کس خطا پر ماری گئی؟

اعتراض: سوال تو قاتل سے کیا جاتا ہے کہ تم نے کیوں قتل کیا یا مارنے کی وجہ کیا تھی؟ مقتول سے نہیں۔

جواب: قیامت کے دن زندہ دفن کی ہوئی بچیوں سے سوال اس لیے پوچھا جائے گا، تاکہ وہ بتائیں کہ بے گناہ قتل ہوئے، پھر سب کے سامنے قاتلوں کو ملامت اور زجر و توبیخ کی جائے کہ انہوں نے بے گناہوں کو بے گناہ قتل کر ڈالا۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نصاری جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہی بنا ڈالا ان کے بارے میں حضرت عیسیٰ سے پوچھے گا، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾[سورۃ المائدہ: ۱۱۶]

ترجمہ: اور جب اللہ فرمائے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تو نے لوگوں سے کہا کہ مجھے اور میری ماں کو دو خدا بنالو۔

تو یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ آپ کی قوم کو زجر و توبیخ کرنا اور ان پر ملامت کرنا مقصود ہے، اسی طرح اوپر کی آیت میں ہے۔

سورۃ المطففین

﴿وَ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا سِجِّيۡنٌ ، كِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ (۹)﴾

[سورۃ المطففین: ۹-۸]

ترجمہ: اور تو کیا جانے سجین کیسی ہے وہ لکھت ایک مہر کیا ہوا نوشتہ ہے۔

اعتراض: سجین ایک مقام ہے۔اس کی تفسیر کتاب مرقوم یعنی لکھی ہوئی کتاب سے کرنا کس طرح اس کے مطابق ہے؟

جواب: مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے آیت ہے:) كَلَّاۤ اِنَّ كِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِىۡ سِجِّيۡنٍ ،تو کتاب مرقوم، کتاب الفجار کی صفت معنوی ہے اسی کی تفسیر کر رہی ہے، لہذا سجین کتاب مرقوم سے متعلق نہیں ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ سجین کی ہی تشریح ہے اور اس میں کتاب کا لفظ محذوف ہے اور معنی یہ ہوا کہ وہ کتاب سجین کتاب مرقوم ہے۔

سورۃ الانشقاق

﴿إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ، وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ﴾[سورۃ الانشقاق:۲-۱]

ترجمہ: جب آسمان شق ہوجائے اور اپنے رب کا حکم سنے، اور اسے یہی لائق ہے۔

اعتراض: اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّت میں''اِذَا '' کا جواب کہاں ہے؟

جواب : ا ۔ مذکورہ آیت کریمہ میں اور اس کے علاوہ کثیر مقامات پر اس طرح کی تعبیر ہے اور کہیں بھی اذا کا جواب مذکور نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی غرض سے ترک کر دیا ہو کہ اس طرح قرآن پاک میں بکثرت وارد ہے اور بار بار اس کی تکرار پائی گئی ہے۔

۲۔اذا کا جواب''اذنت '' ہے اور ماقبل کا''واو'' زائدہ ہے۔

۳۔ایک قول یہ ہے کہ اس کا جواب محذوف ہے اور اصل عبارت یہ ہے'' إذا السماء انشقت رأى الإنسان ما قدم من خير و شر ''یعنی جب آسمان شق ہوگا تو انسان دیکھ لے گا خیر وشر جو اس نے آگے بھیجی ہے۔

اس کے علاوہ بھی جہاں جہاں قرآن پاک میں''اذا '' کے جواب کو ذکر نہیں کیا گیا وہاں بھی یہ صورتیں ہوسکتی ہیں۔

❁❁❁❁❁

سورۃ الأعلیٰ

﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾[سورۃ الاعلیٰ:۹]

ترجمہ: تو تم نصیحت فرماؤ اگر نصیحت فائدہ دے۔

اعتراض: ''ذکری'' سے مراد احکام شرعیہ ہیں، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو نصیحت فرمانے پر مامور ہیں خواہ لوگوں کو نصیحت نفع دے یا نہ دے، امور دعوت الٰہی لوگوں کو نفع دیں یا نہ دیں نبی پر جو بشکل وہی پیغام آتا ہے وہ تو اس کو پہنچانا رہتا ہے، لیکن اس آیت کریمہ میں کی قید کیوں لگادی؟

جواب: ا۔اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے محبوب آپ ان کو نصیحت کرو اور اپنا پیغام پہنچاؤ خواہ ان کو نفع دے یا نہ دے اس میں ''او لم تنفع'' کو حذف کردیا چوں کہ ''ان نفعت'' اس پر دلالت کررہا ہے۔

۲۔امام ماوردی نے'' النکت والعیون'' میں فرمایا کہ یہاں ''ان'' ''ما'' کے معنی میں ہے اب معنی واضح ہوا کہ جو نصیحت ان کو نفع دے وہ نصیحت کرو۔

سورة الليل

﴿لَا يَصۡلٰىهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَى(١٥)الَّذِیۡ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى(١٦)﴾
[سورة الليل:١٦-١٥]

ترجمہ: اس (جہنم) میں نہیں جائے گا مگر بڑا بد بخت، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

اعتراض: وہ جہنم میں جو بھی بد بخت اور شقی ہوگا وہ جائے گا خواہ چھوٹا بد بخت ہو یا بڑا، پھر اس آیت میں حصر کے ساتھ کیوں کہا گیا کہ جہنم میں وہی جائے گا جو سب سے بڑا بد بخت ہے۔

جواب: ا۔امام ابو عبیدہ کا کہنا ہے کہ یہاں ''اشقی'' شقی کے معنی میں ہے اور اس سے مراد کافر ہے اور اہل عرب کا اسم تفضیل کو اسم فاعل کے معنی میں استعمال کرنا عام بات ہے۔

۲۔اس سے پہلے کی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاَنۡذَرۡتُكُمۡ نَارًا تَلَظّٰى ''لَا يَصۡلٰىهَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَى''﴾
[سورة الليل:١٥-١٤]

یہ جملہ اسی ''نَاراً تَلَظّٰى'' سے صفت یا ''نَاراً'' سے حال واقع ہے۔

زجاج نے کہا: یہاں ایک مخصوص آگ کا ذکر ہے جس میں وہی جائیں گے جو سب سے زیادہ بد بخت ہوں گے۔

﴿وَ سَيُجَنَّبُهَا الۡاَتۡقَى، الَّذِیۡ يُؤۡتِیۡ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى﴾
[سورة الليل:١٨-١٧]

ترجمہ: اور عنقریب اس آگ سے سب سے بڑے پر ہیز گار کو دور رکھا جائے گا جو اپنا مال دیتا ہے تا کہ اسے پاکیزگی ملے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ میں اتقی سے کون مراد ہے؟ کیا کوئی مخصوص فرد یا کوئی مخصوص جماعت مراد ہے؟

جواب: ا۔امام علی بن محمد خازن رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: تمام مفسرین کے نزدیک یہاں اتقی سے مراد حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔ (تفسیر خازن)

۲۔تفسیر طبری میں ہے: اس سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا میں راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرے جہاں صرف کرنے کا حکم ہے اور اس سے وہ اپنے گناہوں کی پاکی چاہتا ہو۔

بعض شیعہ کا کہنا ہے کہ اس میں اتقی سے مراد سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔

اگر لفظ **اتقی** سے یہاں افضل مراد ہو تب بلا شبہ اس سے مراد حضرت ابو بکر صدیق ہی ہوں گے کیوں کہ انبیائے کرام کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق ہی ہیں۔

❁❁❁❁❁

سورۃ الضحی

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ [سورۃ الضحیٰ:۷]

ترجمہ: اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔

اعتراض: اس میں بتایا کہ اللہ عزوجل نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ضال پایا تو ہدایت دی، نبی کوئی بھی کبھی بھی گمراہ نہیں ہوسکتا ہے، نبی تو خود دوسروں کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کا راستہ دکھانے آئے ہیں۔

جواب: ۱۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معالم نبوت اور احکام شریعت کی تفصیل سے بے خبر پایا تو ان کی جانب راہ دی۔

۲۔ یا مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنی محبت میں حضور کو خود رفتہ پایا کہ اپنے نفس اور اپنے مراتب کی خبر بھی نہ رکھتے تھے تو باری تعالیٰ نے آپ کو آپ کی ذات وصفات اور مراتب ودرجات کی معرفت عطا فرمائی۔

۳۔ یہاں ضال کا جو مشہور معنی ہے وہ مراد نہیں سکتا ہے چونکہ دیگر آیات کے خلاف ہے ارشاد باری ہے: ''مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى'' [سورۃ النجم:۲] کہ تمہارے صاحب نہ بہکے نہ بے راہ چلے۔

۴۔ایک قول کے مطابق اس آیت کے معنی یہ ہے کہ آپ کو گمراہ لوگوں کی قوم میں پایا تو راہ دی۔

تفسیر بغوی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک یہ بھی قول

مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بچپن میں جس وقت بہت چھوٹے تھے مکہ کی وادی میں اپنی بکریوں سے علاحدہ ہو گئے تھے۔ پھر ابوجہل نے آپ کو بکریوں سے الگ دور پایا تو حضرت عبدالمطلب کے پاس پہنچایا۔

﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى﴾[سورۃالضحیٰ:۸]

ترجمہ: اور تمہیں حاجت مند پایا تو غنی کر دیا۔

اعتراض: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غنی اور مالدار نہ ہوئے، آپ نے ہمیشہ بظاہر فقر و غربت کی زندگی گزاری بلکہ آپ نے مالداری والی زندگی پسند بھی نہیں کی۔

جواب: ا۔ غنا کثرت مال سے نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی غنا سے یہاں مالداری مراد ہے بلکہ غنا سے مراد یہ ہے کہ جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دیا اس پر راضی ہونا۔

حدیث پاک میں بھی آیا ہے ''الغنی غنی القلب'' کہ مالداری تو دل کی مالداری ہے۔

۲۔ غنی سے اس مال کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت کو لے کر ملک شام گئے اور وہاں بہت زیادہ نفع حاصل ہوا، اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے وہ سارا مال آپ کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔

❁❁❁❁❁

سورۃ التین

﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾[سورۃ التین:٦-٥]

ترجمہ: پھر اسے (انسان کو) ہر نیچی سے نیچی حالت کی طرف پھیر دیا۔ مگر وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے تو ان کے لیے بے انتہا ثواب ہے۔

اعتراض: یہاں الا کے ذریعہ جو استثنا کیا گیا ہے وہ کس طرح درست ہے، اور اس سے کیا مراد ہے؟۔

جواب: ا۔ اگر ''اسفل سافلین'' سے مراد جہنم میں داخل کرنا ہے تب یہ استثنا متصل ہوگا اور ''فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ'' قائم مقام ''فلا نردهم اسفل سافلين'' کے ہوگا اب آیت کے معنی یہ ہوگا کہ ہم نے لوگوں کو (ان کے اعمال کے سبب) جہنم کی طرف پھیر دیا مگر جو ایمان لائے تو ان کو جہنم کی طرف نہ پھیرا ان کے لیے بے انتہا اجر وثواب بھی رکھا۔

۲۔ اور اگر ''اسفل سافلین'' سے مراد بڑھاپے اور کمزوری کی طرف پھیرنا ہے تب استثنا منقطع ہوگا اور معنی یہ ہوگا جو لوگ جوانی میں ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور بڑھاپا آنے سے پہلے جب تک طاقت تھی خوب عبادت ریاضت کی لیکن جب بڑھاپا آ گیا تو عاجز آ گئے تو اب ہم ان کو اجر وثواب عطا کریں گے اگرچہ بڑھاپے میں وہ عبادت وریاضت نہ کرسکے۔

سورة البينة

﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴾[سورة البينة:۴]

ترجمہ: اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی انہوں نے آپس میں تفرقہ نہ ڈالا مگر اس کے بعد کہ وہ روشن دلیل ان کے پاس آ چکی تھی۔

اعتراض: یہاں ''اوتوا الکتاب'' سے مراد اہل کتاب یہود و نصاری ہیں اور بینہ سے مراد جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا قرآن ہے۔اب معنی یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کے آنے کے بعد میں اختلاف و تفرقہ پیدا ہوا ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے، وہ تو شروع سے ہی مخالف تھے اور ایک دوسرے کی تکفیر کرتے تھے۔

جواب: بلاشبہ یہود و نصاری میں آپسی اختلاف تو پہلے سے ہی تھا ان کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ﴾[سورة البقرہ:۱۱۳]

ترجمہ: اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں۔

لیکن آیت مذکورہ میں مراد یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ کی بعثت کے بعد ان کی تصدیق اور ان پر ایمان لانے کے متعلق تفرقہ پیدا ہوا ہے، جب تک ان کی بعثت نہ ہوئی تب تک تورات، انجیل میں ان کے متعلق

بشارتیں پڑھتے اور سنتے سناتے تھےلیکن جب آپ کی بعثت ہوئی تو وہ آپس میں متفرق ہو گئے بعض ایمان لائے،بعض انکار کر بیٹھے اور بعض ان آیتوں کے معنی ومفہوم کو چھپانے لگےجن میں آپ کی بعثت اورآپ پر ایمان لانے کا تذکرہ تھا۔

❁❁❁❁❁

سورۃ الھمزۃ

﴿وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ (١) الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ﴾

[سورۃ الھمزہ: ۲-۱]

ترجمہ: خرابی ہے اس کے لیے جو لوگوں کے منہ پر عیب نکالے، پیٹھ پیچھے برائی کرے۔

اعتراض: مذکورہ آیت کریمہ میں ''ھمزۃ'' اور ''لمزۃ'' دونوں لفظ کا ذکر ہے جبکہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں تو دونوں کو ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ا۔ ان دونوں الفاظ میں فرق ہے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ھمزۃ'' چغل خور ہے اور ''لمزۃ'' عیب نکالنے والا ہے۔

۲۔ دونوں کا ایک معنی ہے البتہ دوسرا لفظ اول کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔

۳: ایک قول یہ ہے کہ ''ھمزۃ'' لوگوں میں عیب تلاش کرنے والے کو کہتے ہیں اورر ''لمرۃ'' لوگوں کے نسب میں عیب تلاش کرنے والے کو کہتے ہیں۔

❁❁❁❁❁

سورۃالفیل

﴿وَأَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا أَبَابِيلَ﴾[سورۃالفیل:۳]

ترجمہ:اوران پرفوج درفوج پرندے بھیجے۔

اعتراض: لفظ ابابیل واحد ہے یا جمع ، اگرجمع ہےتو اس کی واحد کیا ہے؟اوراس سے مراد کیاہے؟

جواب: ابابیل کےمعنی متفرق پرندے جوساتھ مل کراڑتے ہیں اور اڑنے میں ایک دوسرے کااتباع کرتے ہیں۔

ابوعبیدہ کا کہنا ہے کہ اس کے معنی ہیں جماعات متفرقہ لہذا اگرمختلف گھوڑے بھی جماعت کےساتھ آئیں توان کوبھی ابابیل کہاجائے۔

اس لفظ کے واحد یا جمع میں اختلاف ہےبعض نے کہا کہ یہ جمع ہے اور ایسی جمع ہے کہ اس کا واحد آتا ہی نہیں ہےلہذا یہ لفظ بھی شماطیط اورعبادید کے مانندہوگیا کہ صرف جمع ہی استعمال ہوتے ہیں ان کاواحدنہیں آتا۔

بعض لوگوں نے کہا: ابابیل کا واحد إبول ’’’’أبیل ‘‘اور’’أبال ‘‘ آتا ہےاورایک قول’’إبّیل ‘‘ کابھی ہے۔

❁❁❁❁❁

سورۃالماعون

﴿فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّينَ، الَّذِينَ هُمۡ عَن صَلَاتِهِمۡ سَاهُونَ﴾
[سورۃالماعون:۵-۴]

ترجمہ: توان نمازیوں کے لیےخرابی ہے جواپنی نماز بھولے بیٹھے ہیں۔

اعتراض: جو لوگ اپنی نماز پڑھنا بھول جاتے ہیں ان کے لیے ہلاکت کیوں ہے؟ حالانکہ حدیث پاک میں تو یوں ہے کہ میری امت سے خطا اورنسیان اٹھالیے گئے یعنی ان پر مواخذہ نہ ہوگا۔

جواب: اس مقام پر''ساھون'' سے مراد غافلون ہے کہ جولوگ اپنی نماز سے غافل بیٹھے ہیں اور یہ منافقین کا شعار ہے اسی لیے ان پر ویل اور ہلاکت کی وعید آئی ہے۔

دوسرے مقام پر منافقین کی حالت قرآن پاک نے یوں بیان فرمائی:

﴿لَا يَأۡتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمۡ كُسَالَىٰ﴾[سورۃالتوبہ:۵۴]

ترجمہ: وہ نماز کونہیں آتے مگر جی ہارے۔

سورۃ المسد

﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ﴾[سورۃ المسد: ۱]

ترجمہ: ابولہب کے دونوں ہاتھ تباہ ہوجائیں اور وہ تباہ ہی ہوگیا۔

اعتراض: اول: یہاں ابولہب کے ہاتھوں کے تباہ ہونے کا ذکر کیوں کیا کہ اس کے ہاتھ ہلاک ہوجائیں حالانکہ وہ پورا ہلاک ہوا۔

دوم: ابولہب کو اس کی کنیت سے کیوں پکارا گیا اور نام نہ ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ۱۔ یہاں مجاز مرسل ہے جز بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ ہاتھ بول کر اس کی پوری ذات مراد ہے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾[سورۃ البقرہ: ۴۳] کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یہاں بھی جزء بول کر کل مراد ہے لہذا رکوع سے پوری نماز مراد ہے۔ کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو۔

دوم: ۱۔ ابولہب اپنے نام سے مشہور نہ تھا کنیت سے ہی جانا جاتا تھا اسی لیے اس کی کنیت ذکر کردی تاکہ بآسانی اس طرف تبادر ذہنی ہوجائے۔

۲۔ ابولہب کا نام عبد العزی تھا، عزی ایک بت تھا کفار جس کی عبادت کرتے تھے اب اس کے معنی ہوئے عزی کا بندہ اور قرآن پاک میں اللہ پاک کے سوا کسی اور کی بندگی کا ذکر مناسب نہ تھا اسی لیے نام ذکر نہ کیا۔

اور کفار یہ بھی طعنہ دے سکتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو کہتے ہیں کہ سب اللہ کے بندے ہیں لیکن ان کا قرآن بتا رہا ہے کہ یہ ابولہب ایک بُت کا بندہ ہے، اس لیے اللہ پاک نے سدِ راہ فرما کر کنیت سے اس کا ذکر فرمایا۔

❁❁❁❁❁

سورۃ الإخلاص

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ (١) اللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ [سورۃ الاخلاص: ۲-۱]

ترجمہ: اے محبوب! تم فرمادو: وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے۔

اعتراض: لفظ ''احد'' اور واحد میں استعمال کے اعتبار سے فرق ہے۔ لفظ واحد کا استعمال اثبات کے بعد ہوتا ہے اور لفظ ''احد'' کا استعمال نفی کے بعد لیکن مذکورہ آیت میں اثبات کے بعد ''احد'' کا استعمال کیا گیا ہے؟

جواب: یہ کوئی اصول وضابطہ نہیں ہے کہ اثبات کے بعد واحد اور نفی کے بعد ''احد'' کا استعمال کریں۔ ہاں غالباً ایسا ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے چوں کہ یہ کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ اس کی تائید اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

﴿فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ﴾
[سورۃ الکھف: ۱۹]

مذکورہ آیت میں اثبات کے بعد ''احد'' کا استعمال ہوا ہے اسی طرح ''قل ھو اللہ احد'' میں بھی ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کے مقابلہ میں ''صمد'' کو ذکر کیا ہے اسی لیے وزن کی رعایت کے لحاظ سے ''احد'' ذکر کر دیا گیا ہے۔

تمت بالخیر

والحمدللہ رب العامین

ہماری مطبوعات

DIFA-E-QURAN

